تین موسم پت جھڑ کے

جھوٹا ساون ایک

محسن علی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

بار اول : فروری ۱۹۹۸ء
طباعت : لکی پریس، حیدرآباد
تعداد : ۵۰۰
قیمت : ۵۵ روپے

ملنے کے پتے

شالیمار پبلیکیشنز ـ محبوب بازار چادرگھاٹ حیدرآباد ۲۴-
محسن علی ۱۲/۳-۶-۲-۸ روڈ نمبر ۱۰ بنجارہ ہلز ـ حیدرآباد
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ـ ممبئی ـ دہلی ـ لکھنؤ
ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس ـ گولا مارکیٹ ـ دہلی ۱۱۰۰۰۲

انتساب

اُن ساری یادوں کے نام جو میری یار و مددگار رہیں
اس زندگی کے ہر موسم میں

اِس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب آنکھ کھلی دل کی تو موسم تھا خزاں کا

(سوداؔ)

ایک بات

ایک بڑا ذہن کسی بھی قسم کے تعصب سے کس قدر دُور ہوتا ہے جرمنی کے مشہور
زمانہ فلسفی و شاعر گیٹے نے ہمارے کالیداس جی کو اُنکی مشہور و معروف تخلیق
" شکنتلا " کیلئے کیسے پُر وقار اور معنی خیز الفاظ میں خراج ادا کیا تھا۔ گیٹے نے کہا تھا

"KALIDASA'S SHAKUNTALA CONTAINES THE LIVELINESS OF SPRING AND THE RIPENESS OF AUTUMN"

کالیداس کے دور (چوتھی پانچویں صدی) اور گیٹے کے دور (۱۸ ویں صدی) میں ۱۳،
۱۴ صدیوں کا فرق ہے لیکن گیٹے نے جس تازگی احساس و نظر کے ساتھ اپنی بلیغ رائے کا
اظہار کیا ہے۔ اس میں تو سچ مچ بسنت کی رُت کی تازگی اور پت جھڑ کی رُت کا رچاؤ
ملتا ہے کہاں کوئی قدیم اور جدید کا سبھاؤ۔ ؟ عظمتِ تخلیق کا اظہار بھی ہے اور گیٹے کی رائے
میں عظمتِ احساس و نظر بھی۔

آج کے دور میں بھی کسی تخلیق ادب و شعر کے تعلق سے ہم اپنی رائے دینے کا اتنا ہی
حق رکھتے ہیں جتنا کہ پہلے تھا۔ گیٹے نے کس شان حق گوئی کے ساتھ اپنی رائے دی ہے ضروری
نہیں کہ ایسی ہی رائے آپ بھی دیں اور ضروری نہیں کہ کوئی نئی یا پرانی تصنیف جو آپ تک
پہونچے اُس کو آپ پڑھیں بھی۔ لیکن ضروری یہ ہے کہ بنا پڑھے آپ اُس کے تعلق
سے کوئی رائے نہ دیں۔ آج کے دور میں یہ آپ کا ایک زیادہ بڑا اخلاقی کارنامہ ہوگا۔

A SUGGESTION :-

SIMILAR TO THE STATUTORY WARNING PRINTED ON CIGARETTES, WHICH IN EFFECT IN ENCOURANGING SMOKING, A STATUTORY WARNING BEISPRINTED ON EVERY NEW BOOK ALSO. WHICH IN EFFECT, WOULD ENCOURAGE READING HABITS — SAY —
"READING BOOKS IS INJURIOUS TO HEALTH."

MOHSIN

بادۂ کہن ـــــ عُرف چراغِ دہر

قصور تو اُس چراغِ دہر کا تھا۔ نہ وہ روشن ہوتا نہ وہ تُرک ستمگر نظر آتا۔ اور پھر نہ وہ بُجھتا نہ اچانک اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا۔ اور پھر اندھیرے میں وہ ـــ!!

کچھ صدی بھر سے تو گرتی رہی ہوگی اُن بوسیدہ دیواروں کی مٹی ـــ اور کچھ اتنا ہی بوسیدہ وقت کچھ بچ رہی چھتوں اور دیواروں کی دراڑوں میں جالے بُنتا رہا ہوگا۔ سرائے تو تھی کسی فقیر کی، جس کا نام کسی کو یاد نہیں تھا۔ بس دُور دُور تک مشہور تھی بڑی سرائے کے نام سے۔ آس پاس کی چھوٹی بڑی پہاڑیوں سے اُتر کر گھاٹیوں سے گذر کر آتے تھے سوداگر۔ بیوپاری۔ گاؤں سے، قصبوں سے، قریوں سے، گھوڑا گاڑیوں سے، بیل بنڈیوں سے، خچروں سے، اُن پر لادے سامان کی گھٹریاں، بوریاں اور لا کر رکھ دیتے سرائے کے بے آسرا دالانوں میں، اندھیری کوٹھڑیوں، تاریک کونوں کھدروں میں۔

سرائے کے گرے پڑے حصوں سے بھی حساب کچھ ایسا ہی جمتا کہ ہوں گے کوئی پانچ چھے لمبے چوڑے ہال، کچھ بن روشنی کے حجرے۔ گری پڑی بھی تھی تو دو منزلہ تھی سرائے۔ اُس کا صحن تو توبہ، زمین جیسے مفت ملتی تھی کبھی ـــ دو تین بڑے ہی گھنے پیڑ نیم کے، اُن کے سائے میں ایک بڑا کنواں ـــ سویرے سویرے ہی کنویں پر چرخی کی چوں چوں چلتی ہوتی۔ کنویں سے تھوڑی دُور پیچھے بڑا قبرستان ایک دو قبریں نظر پڑتی تھیں۔ باقی تو سب ڈھیر۔ صرف خیالِ قبر یا مزار خیال ـــ

سرائے میں سبھی کچھ ہوتا۔ مزے مزے کی باتیں، مزے مزے کے کھیل والے۔ اکثر خاں سے روٹھ جانے والی مالن بی بندریا۔ وہیں کہیں زندہ ناگوں کی پٹاری پر سر رکھے لیٹا ہوا مداری۔ پتھر کو لڈو اور سادا کاغذ کو کرنسی نوٹ بنانے والا جادوگر اور کرتب باز۔ سب ایک ہی ہال میں ہوتے، ہنستے بولتے، گاتے بجاتے۔ لیکن نوٹنکی والے تو ذرا دور دور کے حجروں میں یا کھلے کھلے دروازوں میں، کمالوں میں ہوتے۔ اُن کے پاس سب کچھ ہوتا۔ بانسری، ڈھولک، پرانا ہارمنیم، تغیری، دف اور پھر پصرا کی حور۔ منڈلی میں منچ سجتا۔ گلابی رنگ کا ایک مہین سا پردا ہوتا جیسے آنکھ کا آسرا۔ اندر روشنی ہو جاتی تو سب کچھ نظر آ جاتا۔ تب دیکھنے والوں کے دلوں میں انگارے دہکنے لگتے کہ بس پردا اُٹھے اور وہ اپنی ننگی آنکھوں سے دیکھیں ہائے۔ پھر چھناچھن، اور پھر اُس حور کی زنگاری آنکھوں سے زہر چھنتا۔ بس زہر ہی زہر۔ کیوں نہ ہمیں مرجائیں۔ زرنیست عشق ٹیں ٹیں۔ آخر وہی ہوتا جو قسمت میں ہوتا۔ اُسی بدیسی زہر کے نشے میں کچھ دیسی اور سستہ نشہ ملا کر وہ نوٹنکی دیکھنے والے مسافر جاتے واپس سرائے کو۔

شام سے رات ہونے لگتی اور دل والے دکھ سکھ کے گیت گاتے گاتے بے سدھ پڑ جاتے سرائے کے اُن بوسیدہ کونے کھدروں میں۔ پھر سرائے کی رات کا نظر نہ آنے والا سایہ دھیرے دھیرے اُس قریب کے قبرستان کا سناٹا بن جاتا۔ اِدھر اُدھر اندھیرے میں جگنو اڑتے ہوتے۔ مگر اُن کی تو کوئی آواز ہی نہیں۔ جگ بھر کی خاموشی سے گہری خاموشی ہوتی ہے اُن جگنوؤں کی۔ اور اب کل کی رات کیسی رہی ہو گی نہیں پتہ۔ لیکن آج کی رات کی خاموشی تو ساری سرائے کی خاموشی سے بھی زیادہ بوسیدہ لگتی ہے۔

اُن ساری خاموشیوں کے کھنڈر میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی کچھ بھی سمجھ میں نہ آنے والے اُن اندھیروں کے بیچ دراصل وہ بھی پھنسا ہوتا۔ عجیب واردات تھی۔

بیس بائیس سال کی اچھی خاصی سرخ ڈوروں والی اپنی آنکھوں سے جو اُس سے زیادہ حیران پریشان لگتیں، وہ دیکھتا ہوتا۔ دن کے اُجالوں کو ــ رات کے اندھیروں کو ـ اپنے آپ کو اتنا بدیسی سمجھتا جیسے کوئی آہوئے صحرا یہاں انسانوں کے بیچ آ گیا ہے۔

دس دن تو ہو گئے تھے اُسے اس سرائے تک پہونچے ہوئے۔ ایک نصف چھت والی کوٹھری مل گئی تھی اُسے یہاں اپنے قیام کے لئے۔

دن میں تو خیر کیا ہوتا، پتہ نہیں، ہاں سرِ شام ہلکے دھندلکوں میں اُس کا چہرہ کچھ آبدار ہی لگتا۔ ہلکی روشنی جیسا ـ آنکھیں تو تھیں ہی اُس کی فیروزی چمک لی ہوئیں۔ اُس پر معصوم ایسا کہ دیکھنے والے سب اُسی کے ہو جائیں، وہ اُس سے کچھ پوچھتے تو گلابوں کی سی نمی لیئے ہونٹوں پر تبسم کا اظہار کرتا۔ بڑا ہی خوش کلام تھا اُس کا "رخِ روشن" چھواروں جیسی مٹھاس تھی اُس کی باتوں میں۔ سرتاپا حسنِ خوش خصال۔ اُس کے کھلے رنگ کو اور گلابی بنانے والا، اُس کی رگوں میں دوڑنے والا خون تھا، جس کی ہر لہر میں اُس کی مردانگی اور مردانگی کا شباب تھا۔ شباب بھی ایسا بیتاب کہ بس یہاں پھوٹ پڑے، وہاں پھوٹ پڑے اور پھوٹے تو احساسِ شرافت کے حصار مسمار ہو جائیں اور ایک تیز رو جھرنا پھوٹ پڑے اور انوکھے، نرالے اور نئے نئے جذبات کے سنگ وحشت ساتھ بہلے جائیں۔

دس دن سے سرائے میں آنے جانے والے سارے مسافر اُسے دھرتی کی سب سے اچھی مخلوق سمجھ کر دیکھتے، آنکھوں سے پیار کرتے، مسکرا مسکرا کر اپنا سمجھتے اور اپنی خوش اخلاقیوں میں اُسے محفوظ رکھنے کی تمنا کرتے ـــ وہ اُس کو اوپر کے پہاڑیوں، ندیوں یا صحراؤں کا سمجھتے۔ وہ اُسے پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکتے خانہ بدوش قافلوں کا پالا پوسا سمجھتے ـــ پتھر مل گئے تھے اُسے جب اُس کا قبیلہ کہیں لٹ گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی جنگ میں نیست و نابود ہو گیا تھا اور وہ بھاگ نکلا تھا اُن پتھروں کے ساتھ۔

رنگ برنگے، چمک دمک والے۔ دوسرے قافلے والے ملے تو سب نے ساتھ لے لیا اور اگلی منزلوں تک پہونچایا۔ جب اور کچھ بڑا ہو گیا تو ذرا زیادہ ہی آنکھیں کھولے سب کو دیکھنے لگا۔ بنجر والوں سے ملتا تو اُن کے ساتھ گھل مِل جاتا۔ وہ سب اُس کو نہ صرف راہ بتانے بلکہ اُس کو ساتھ لے لیتے۔ وہ اس طرح تجارت کا عادی ہونے لگا تھا ـــ وہ پھر اور نیچے آگیا۔ بھارت کے بیچ۔ پھر اور نیچے اور پھر اُس سرائے تک پہونچ گیا کہ کسی نے اُس کو قصص پُر اسرار سنائے تھے اِس رُخ کے اور اس رُخ پر ملنے والے، مال و زر اور حیات خوشتر کے۔ اب اُس کا قد بھی بہت موزوں لگتا تھا اور دست و پا بھی خوشنما۔ جنگلی ہواؤں میں لہلہاتے ہوئے سرسبز و شاداب ایک مضبوط پیڑ کے رگ پٹھوں سے بنے۔ آنکھیں بھی زیادہ روشن روشن لیکن چہرے پر بے باکی کا انداز پھر بھی کچھ دبا دبا سا تھا۔ بس ایک دل آویز مردِ جواں اور صحراؤں میں پلی بے خبر مردانگی ۔ واہ ـــ

سرائے میں آئے ہوئے دس دن تو ہوئے تھے لیکن دس راتیں بھی تو گذاری تھیں اُس نے۔ اس نیم دیواروں، دریچوں کے حجرے میں۔

اب تو رات تھی۔ اُس نوٹنکی کے متوالوں کو اُس رات کی خاموشی سے زیر ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ نصف شب کی ہوائیں تھیں بس ۔ منڈی تو کب کی چپ ہو چکی تھی ـــ قبرستان بھی کچھ دور ہی تھا اور ساری سرائے بھی اب اپنی چپ میں دراز ـــ

احساس جیسی دھیمی، کچھ گماں جیسی بے بدن ایک چھم۔ ہلکا سا وہ چونک گیا۔ پھر ایک چھم پھر رات کا ہر لمحہ چھم ـــ رات کی ہر سانس چھم ـــ قریب بھی نہیں، دور، بہت دور جیسے رات ہی گھنگھرو باندھے، دور کی پہاڑی سے اُتر رہی ہے، بستی کی طرف چلی ہے اور ہواؤں کے ساتھ ادھر سرائے کی طرف آرہی ہے چھم ـــ چھم۔ کان نہ سنیں تو نہ سنیں، احساس تو سن رہا ہے ـــ یہ کیا ہے؟ یہ گمان ہے یا ..... ؟ پھر چھم ـــ اُس

ٹوٹی دیوار کی مٹی میں چھم ۔ اُف اب کان میں بھی بس یہی بات ہے ۔۔۔ "ہاں ہوگی کوئی نوٹنگی والی"
گھنگھرو باندھے گئی ہوگی کسی اپنے کے پاس" ۔۔۔ وہ ہنسا خود سے کچھ شرمائے ہوئے۔
"یہی تو عمر ہوتی ہے" اس سُر سنگیت کی مٹھاس میں، اس سحر زا کیفیتوں میں ملنے کی ۔۔۔
وہ پھر ہنسا ۔۔۔ مگر پھر اُن دیواروں کی بوسیدگی میں بھی چھم سی صدا، اُس حجرے کی
سیاہیوں میں بھی چھم کی صدا ۔۔۔ اوہ ۔۔۔ وہ کچھ سنبھلا اور دیا سلائی جلائی۔
اِس یقین کے ساتھ کہ وہاں کچھ نظر نہیں آئے گا ۔۔۔ چراغ جلایا، جل اُٹھا چراغ ۔۔۔ وہ
سامنے تھی۔ اُس کے حلق سے نکلی ہوئی چیخ سے زیادہ زوردار چیخ اُس کی آنکھوں سے نکلی۔
جس کو اُس نے دیکھ بھی لیا اور سُن بھی لیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا اُس کو ہر طرح
چھونے والی عطر بیز ہوا دُں نے نہیں بلکہ ایک لرزیدہ، نیم جھج جیسا ہاتھ چراغ کی لو کو
اپنی گرفت میں لے بھی لیا اور اُسے بُجھا بھی دیا۔ اور وہاں جو اندھیرا چھا گیا، وہ اپنی اکھڑی اکھڑی
سانسوں میں بولنے بھی لگا، اپنی بھینی خوشبو کے ساتھ ۔۔۔

"گھبرانا نہیں۔ میں تیری ہوں اور میں کیسی ہوں کل کے اُجالے میں دیکھ لینا۔ اب
روشنی نہ کرنا اور ڈرنا نہیں ۔۔۔ مرد عورت سے ڈرتا نہیں ۔۔۔ میں تو تیری ہی سانسیں
لے رہی ہوں۔ تیرے پاس ہوں ۔۔۔ اور ۔۔۔

اس مرد نو خیز کے بدن پر پسینے پھوٹ پڑے تھے، اُن کو یہ الفاظ خشک کر رہے
تھے اور اُس کے مساموں میں ہلکی ہلکی حرارت پیدا کر رہے تھے۔ کنگنوں کی ہلکی جھنکار
سنائی دی ۔۔۔ پھر اندھیرے میں دو خونی آنکھوں کی چمک ۔۔۔ سانسیں اکھڑی ہوئیں جیسے
اندر اندر جو آنچ ہے اُس کی جلن ہے سانسوں میں ۔۔۔ اُس اندھیرے میں کچھ جھلملاتی
بے تابیوں کے ساتھ بہت قریب آنے والا وہ ایک دہکتا بدن۔

اُس حیرت زدہ مرد کو یقین نا ہو رہا ہو کہ یہ سب کچھ ایک فریب ہے۔ پھر
وہ سوچتا ہے، یہ تو نظر آنے والے رنگ ہیں اندھیرے کے اور اُن اکھڑی سانسوں میں بھی
جھجک سے پھنسے ہوتے الفاظ ہیں۔

"تجھے آٹھ دن سے روز دیکھتی ہوں۔ تیرے تو ربھرے بپھرے کو دیکھتی ہوں۔ ڈرتی تو تھی میں۔ لیکن پکی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ ایسے ڈرتی رہی تو تجھے پاؤں گی کیسے۔ میں جیونگی کیسے۔۔ دیکھ ان آٹھ راتوں کی نیند لئے آئی ہوں۔ ان آٹھ راتوں کی نیند مجھے سلا دے ۔۔ تو مرد ہے اور میرا ہے۔ میں تو ایک بے درد جوانی ہوں جنگل کی پلی۔ میں چاقو چھری بیچتی ہوں۔ میرا ایک قبیلہ ہے ۔ تو تو روز دیکھتا ہوگا یہاں کے سب لوگ باگ کیسے سہمے رہتے ہیں میرے قبیلے والوں سے۔ جیسے ہم سب کو چکو چھری سے زخم لگا دیتے ہیں اور لوٹ لیتے ہیں اُن کو ۔۔ اسی سرائے سے دور، ذرا اُس طرف قبرستان سے پرے ہمارے خیمے ہیں ۔ پولیس آگے آنے نہیں دیتی۔ مگر منڈی میں سارا سارا دن، دھوپ میں تپتی ہوئی بنا پلک جھپکائے تجھے دیکھتی رہی ہوں، آٹھ دن سے۔

اُس مرد کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔ وہ اُس سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا تھا جو اُس کے دماغ کی گرمی میں بار بار پگھل جاتا تھا۔

"تو بھی ...... تم ....."

"چپ رہ، کچھ نہ کہنا۔ ٹھہر ۔۔۔" اُس کے بدن میں بجلی کی سی لہر دوڑ گئی۔ بولی "یہ لے، یہ ہے چھرا ۔۔ بہت تیز۔ تیری نظروں جیسا ۔۔ یہ چھرا گھونپ دے میرے سینے میں ۔۔ یہی ہے وہ آخری گھڑی میری جندگی کی ۔۔۔ دھن تیری کی" ۔۔ اُس نے اُس کے قریب جا کر اپنا سینہ کھول دیا۔ مرد نے اندھیرے میں بہت کچھ دیکھ لیا ۔۔۔" ایسے یہ سب کچھ میں زیادہ سہہ سکتی ہوں نہ جی سکتی ہوں ۔۔۔ اُس نے جیسے اپنے ہی بدن کو زخمی کر لیا۔ "مار دے مجھے۔ خون کر دے میرا ۔۔ اگر میں تجھے پسند نہیں تو بول دے نا مجھے۔"

مرد اُس کے ذرا قریب ہو گیا۔ اُسے غور سے دیکھنے کے لئے۔

اُس کی رکی ہوئی سانس ابھی چھوٹی بھی نہ تھی کہ دو انگارے اُس مرد کے ہونٹوں کو آگے وہ تڑپ گئی۔ بیکل ہو گئی اپنے جلتے بھنتے ہونٹوں میں اُس مرد کے ہونٹوں کو دبا لیا۔

کھینچ لیا اور چبا ڈالا۔ کون ہوں میں' بول ۔۔ خونخوار جانور ہوں۔ اِس گھڑی مجھے جو کچھ چاہیئے لے لوں گی۔ تیرا خون پی جاؤں گی اور یہاں سے بھاگ جاؤں گی۔

مرد کچھ چونکا اور پوری قوت سے اپنی سانسوں کو اپنے سینے میں دبائے ہوئے کچھ سنبھلے لہجے میں پوچھا ۔۔ "کون ہو تم" ؟

وہ پھر بپھر کر لپکی اُس کی طرف۔ اُس کے سینے پر چھُرا رکھ دیا۔ بولی

"یہ جانے بنا یہ سب کچھ تجھے قبول نہیں کیا ۔۔ بول۔ میں تیرا خون چکھ کر سمجھ جاؤں گی تو مرد ہے یا نہیں ۔۔ لے ، قبول کر سب کچھ"۔ وہ اُس پر جھپٹ کر اپنے ہونٹ اپنے ہی دانتوں سے چباتی رہی۔ اُس کے ہونٹوں پر اپنا سر رگڑنے لگی اور پھر کچھ ایسے سنبھلی جیسے سب کچھ طے ہو گیا ہو۔ مرد کے گرم گرم سینے پر اپنے گرم گرم گال رکھ دیئے اور اپنا پن جتانے کیلئے اُس اندھیرے میں نظر آنے والی اپنی اُنگلی اُس کے سینے پر رکھ دی اور بولی ۔۔ "بہت گھبرا گیا نا تو ؟ دیکھ موت ایسے ہی اچانک آجاتی ہے۔"

مرد مسکرا پڑا تو وہ اب کچھ سنبھلے لہجے میں بولی۔

"دیکھ اب میں آئی ہوں تیرے پاس۔ تیرے اِن قیمتی پتھروں کا ایک ہار لینے ۔۔ وہ لال، سبز، پتھروں والا ہار ۔۔ تاروں جیسے جگمگانے والے پتھر۔ ہاں۔ اب سمجھ گیا نا مجھے۔ بول مجھے دے گا نا وہ ہار یا پھر میں چلی جاؤں ؟"

پہلی بار اُس مرد کو اپنے گرم گرم بازو بے قابو لگے۔ جو بے تحاشہ انداز میں اُس اندھیرے میں ہلکے سے دمک جانے والے اُس نرم و گداز بدن کو سمیٹ لینے کیلئے بڑھ گئے ۔۔ وہ تڑپ کر اُٹھی اور بولی۔

"ٹھہر میں تیرے لیئے نہیں، تیرے قیمتی پتھروں کے لیئے آئی ہوں ۔"

بنا کچھ سوچے سمجھے مرد نے قریب کے ایک بکسے کے اندر مخمل میں لپٹے ہوئے سارے پتھر بکھیر دیئے اُس کے سامنے ۔۔ کچھ تو محسوس ہونے والی روشنی ہوئی، جس میں دونوں کے

ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ نظر بھی نہ آئی تھی کہ دونوں کے ہونٹوں پر خون کی نمی پھوٹ پڑی۔ مرد کی زبان کو زخمی کر دیا اُس خونخوار نے، بے سدھ لہجے میں بولی۔

"میرے تپتے ہوئے ریشمی بدن سے جل جاؤ گے تو"

اور رات کے اندھیروں کو بدن کی چنگاریاں جلانے لگیں تو نظر آنے لگا سب کچھ اور ایسے ہی لمحے چھت کے کھلے حصوں سے آسمان کی ہلکی سپیدی نظر پڑی۔ کیا کچھ نظر میں تھا۔ سب کچھ لٹ گیا۔ اُس خونخوار نے اپنے شکار کو کچا چبا ڈالا۔ اور بے خبری سے جب وہ اُٹھی تو خیال آیا۔ "یہ آسمان کی سپیدی کیسی؟ کہیں کہیں رات بھی تو ہے"

اُس بے سدھ مرد کی خوں رنگ نشے سے لبریز آنکھوں میں وہ اپنی چمکتی آنکھیں ڈال کر گھورنے لگی۔ تب ایک بلا بن کر اُٹھنے والی تڑپ کو اپنے اندر دبائے رکھنے کی کوشش میں وہ سر سے پیر تک کانپ گئی ــــ اور سنبھل کر بولی۔

"ہاں تو مرد ہے ــــ سچا مرد۔ پکا مرد ــــ سن، یاد رکھ کل سویرے میری طرف نہیں دیکھنا، مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کرنا ــــ اور نہ ملنے کی ــــ یاد رکھ دو دھاری چکو ہے میری کمر میں سچ مچ ہاں"ــــ

کل میرے ساتھ ہو گا میرا خصم۔ سمجھا؟ اور سانجھ لگے آنے والا ہے، میرا دلبر ــــ حرامی عاشق، میرا مداری جو مجھے ناگن بنا کر ہمیشہ اپنی پٹاری میں رکھتا ہے۔ میں اُسی کے گلے میں ڈال دونگی یہ پتھروں کا ہار ــــ سارے منکے ٹوٹ جائیں گے اُس کی گردن کے ــــ میں کوئی بکنے والی نہیں ہوں ــــ ہاں ــــ اچھی ہوں۔ سچی ہوں اور جو جی میں آئے کرتی ہوں کیا کروں ایک بار ڈر جاؤں تو ساری جندگی بس ڈر ــــ جب سے ڈرنا چھوڑا ناں، ہے یہ رے یہ لہر زندگی کی، جوانی کی ــــ کیا کروں میرے خصم کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ سب کچھ ملا بھی تو وہ سب کچھ نہیں ملا۔ جو میرے اُس حرامی عاشق کی دیوانگی میں ملا۔ اور اُس کی اُس بے وفائی میں ملا۔ اور اُس حرامی کی بے وفائی میں بھی نہیں ملا جو تیری بے خبر مردانگی میں ملا۔ تیری آنکھوں کی وہ پہلے چاندنی جیسی روشنی میں ملا۔ اور تیرے اُس

پیاس کی کراری لذتوں میں ملا۔ کچھ نہیں معلوم رہے تجھے"۔ میں تجھے لوٹ کر جا رہی ہوں پھر کہیں نہیں، کبھی نہیں ملوں گی ۔۔۔ بس اب چھٹی۔ کبھی نہیں ۔۔۔ کبھی نہیں۔ ہو سکتا ہے میری دو دھاری کاٹ چھانٹ سے تو نہیں، مگر اُس کی یاد میں تو مر جائے گا تو۔ خبردار ۔۔۔ میں تیری حرامی عاشق ہوں ۔۔۔ بے وفا ۔۔۔ بس ۔۔۔ مر جا تو ۔۔۔ اب چھٹی۔ بس جیسے ایک کرن جھلملائی اور اچانک گھپ اندھیرا ہو گیا۔ وہ چلی گئی۔

اُس رات کی صبح کے اُجالے کیا تھے، جلوے تھے حسن عشق پسند کے، اِس قدر دشمنِ ہوش! اِس قدر بدچلن، حرام کے جنے۔ اس قدر چرب زبان کہ کتنے ہی نقرئی قہقہے گونج رہے تھے اُس کے کانوں میں، اُس کے آس پاس، اُس کی کچھ سمجھ میں بھی آتا تھا اور کچھ نہ سمجھ سکنے میں اک دل کا قرار بھی محسوس ہو جاتا۔ آخر ۔۔۔ آخر ۔۔۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ وہ اپنی نظر اٹھاتا ہے تو سرگوشی ۔۔۔ نظر جھکاتا ہے تو سرگوشی، ہر سانس میں کچھ الفاظ ۔ کچھ معنی ۔ زبان تک آنے والی بات بے معنی ۔۔۔ اُس کی چپ رہنے کی صلاحیت کہاں گئی ۔ اُس کے قریب قریب آنے والے سناٹے کہاں گئے! اُس کی چپ بھی چھم ۔۔۔ سناٹوں کی آواز بھی چھم ۔۔۔ وہ اپنے دست و بازو کی جنبش میں بھی سنتا وہی چھم ۔۔۔ اور بے حس و حرکت ہو جاتا ہے تو ایک آواز، دھیمی آواز، مسلسل کچھ کہے جا رہی ہے اور اُس آواز کی ہلکی ہلکی لہریں اندر دل میں بس جانے والی وحشت بن رہی ہیں ۔۔۔ کیا یہی وحشت خوئے وفا بنتی ہے؟ یہ وفا بھی کوئی وحشت تو نہیں، خوف تو نہیں؟ کیا یہی خوف عشق ہے، لذتِ جسم و جاں کی کمیابی کا خوف، اُس سے محرومی کا خوف، سانس کے اکھڑ جانے کی وحشت ۔۔۔ کیا وحشت ہی خوئے وفا بنتی ہے۔ کیا یہی خوئے وفا عمر کے کچھ تیز و تند جذبات و احساسات کو اُن بے پناہ لذتوں کے حسین ترین تصورات اور اُن کے جگمگاتے امکانات کی بھول بھلیوں میں لے جاتی ہے، جہاں صحرا ہوتے ہیں تو کہسار ہوتے ہیں یا پھر سطرِ حیات پر لکھا ہوا آخری لفظ ۔۔۔ یہ ساری کونسی کیفیتیں ہیں؟

وہ انسانی وجود جو ذہن و دل کی صلاحیتوں میں محفوظ بھی بنتا ہے اور خطرات سے بھی کھیلتا ہے۔ اُمید و بیم کی چشمکوں سے گذرتا ہے، اس قدر لیے آسرا ہو جاتا ہے بس لیے یار و مددگار ـــــ

اُس نے چھت کے کھلے حصے سے نظر آنے والے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان روشن تھا اور اُس سے دُور، بہت دُور، کروڑوں میل دُور ـــ

۸ا دن اور اٹھارا راتیں وہ اُن صحراؤں اور کہساروں والی بھول بھلیوں میں اپنی کتنی ہی بے تکان، دوڑتے والی آرزوں تمناؤں اور اُمیدوں کے ساتھ بھٹکتا رہا تھا۔ ہاں کبھی پھول کی خوشبو جیسی ٹھنڈی ہواؤں میں یا کبھی دہکتے انگاروں جیسی ہواؤں میں اپنی نظروں کو ہر رُخ پر دُور دُور تک دوڑاتا بھی رہا تھا۔

لیکن اُس بجلی جیسی اپسرا نے کہا تھا: "پھر کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا میرے پاس چکو ہے، سچ سچ، ہاں سچ سچ ـــ"

اُس کے اُس گرتی دیواروں کے حجرے کی بوسیدگی ۸ا دنوں اور ۸ا راتوں سے اُس کے اُن سارے خیالات اور جذبات میں بستی چلی گئی تھی۔ کتنی بار سوچا تھا کہ اُس کھنڈر جیسی سرائے کے اِدھر یا اُدھر کتنے بڑے بڑے سمندروں کی دنیا ہے، ہر سمت میں آسمانوں کے کناروں تک پھیلی ہوئی زمین ہی زمین ہے۔ لیکن گرتی مٹی کی بُو والے اس نیم تاریک حجرے میں بُنتے جالوں میں وہ کیوں پھنستا جا رہا ہے؟

آج منڈی ہی کا دن ہے، چل کر کنوئیں پر سویرے سویرے جی بھر کے نہا لوں۔ اپنے حجرے میں پھیلی ہوئی روشنی میں اپنا قبیلے والا جوڑا پہنوں، ارغوانی رنگ والا، شیشے میں دیکھوں کہ ہاں زندہ ہوں، دو مسالحے دار، گرم گرم تلے ہوئے بیضے، بھونی ہوئی روٹی کے ساتھ کھا لوں اور گرم گرم دودھ پیوں۔ اور پھر زوں زوں چلتا ہوا منڈی میں جاؤں اور اپنی جوڑی چپکلی پتھر کی بنی سیٹ پر بیٹھ جاؤں اور مخمل میں

پڑھے سرخ و سبز، فیروزے، سنگ خارا، وہ سنگ ستارہ، سب پھیلا دوں سامنے۔ دیکھو کون آتا ہے، کون نہیں آتا۔ مرد ہوں تو پھر حیا کیا، کوئی رکاوٹ کیا۔

چمکتی دھوپ میں وہ اس طرح بیٹھا ہوا تھا۔ گاہکوں کے انتظار میں۔ لیکن آج اس کے رنگ برنگی چمک دمک والے پتھروں کو کوئی دیکھتا ہی نہیں تھا۔ پھر بھی ایک نہیں دو نہیں، ہزاروں ہنستی آنکھیں گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں اس کو۔ کتنی آنکھیں آرہی تھیں، جا رہی تھیں، انکو دیکھ کر بار بار وہ اپنی نظریں نیچی کرتا اور کچھ سوچ کر نظریں اٹھاتا اور اپنے پتھروں کو دیکھنے لگتا۔ کیا بازار ہے یہ؟ کس چیز کا بازار ہے یہ؟ —— وہ —— !

دھوپ کی تپش بڑھ گئی اور اس کو گھورنے والی نظروں کا میلا بھی چھٹنے لگا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ تو محفوظ تھا وہ خود کو دیکھ سکتا تھا اور جب بازار کی بھیڑ ادھر ادھر ہو گئی تو اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ پھر دیکھا سامنے گاہک تھا۔

وہ پہلا گاہک تھا جس نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ تازہ موتیا کے پھولوں کے رنگ میں لپٹی ہوئی۔ کالے چمکیلے پتھر سے بنی مورت! اتنا کالا پتھر اور اتنی خوشبودار سفیدی —۔ سامنے دھرتی پر اس طرح بیٹھی ہوئی کہ اس کی لمبی لمبی جھکی ہوئی پلکیں ساری مورت کی رکشا کر رہی تھیں۔ چمکتے سورج پر بھی گہرا بادل آکر ٹھہر گیا تھا پتھروں کے سوداگر نے ایک نظر اوپر دیکھا۔ اس گہرے سیاہ بادل کی طرف جس نے سورج کی تمازت کو اپنے اندر دبا رکھا تھا۔ سوداگر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی کہ سب کچھ اچھا لگتا ہے اب — لیکن یہ لمبی پلکیں اٹھیں تو وہ گاہک کا ارادہ جانے کہ کونسا پتھر چاہیئے اسے — سوداگر نے آہستہ سے پوچھا — "کونسا پتھر چاہیئے؟"

جھکی پلکوں کے اندر سے آواز آئی "اِس کے مول ؟"

"تم سے کیا مول تول ۔ لے جاؤ جو پسند ہے ۔" سوداگر نے یہ بات سوداگر کے لہجے میں کہی ۔

"اچھا ۔۔۔" اگلی بار ۔۔"

"نہیں میں نہیں رہوں گا ۔ وطن جارہا ہوں ۔"

"ہاں ؟؟؟"

جیسے وہ ہزار آنکھیں جو دیر سے اُسے دیکھ کر وہاں سے گذر رہی تھیں اُن دو آنکھوں میں سما گیئں ہوں ۔ لگا نہ اُن دو آنکھوں کو اُس کی بات پر یقین آرہا ہے نہ اُن آنکھوں کی بے یقینی پر خود اُس کو یقین آرہا ہو ۔ عجیب بات ہے ؟

اُن آنکھوں نے ہی اُس سے کہا ۔۔ "اچھا" اور وہ آنکھیں اپنی پلکوں کی چھاؤں میں چلی گیئں ۔ اور اُن آنکھوں کو وہاں سے جاتے ہوئے وہ دیکھتا رہا ۔

سوچا ضرور میری مت ماری گئی ہے ۔ سورج بھی ڈھنگ سے نظر نہیں آتا ۔ سنبھلے سنبھلے انداز میں وہ اپنے آپ کو سمیٹ کر چلا گیا "سرائے کی طرف ۔ سرائے کے حجرے میں پہونچ کر اس طرح بیٹھ گیا اپنی دری پر جیسے بہت تھک گیا ہو آنکھیں بند کرلیں ۔

اب یہ منڈی کتنا پریشان کر دیتی ہے ۔ یہ بستی ، یہ سرائے ، یہ سب کچھ میرا نہیں ۔ میرا نہیں ۔ نکل چلوں ، نکل چلوں ، کہیں اور چلا جاؤں ۔ یہاں کتنی دور تک اکیلا ہوں میں ۔

یہ کروڑوں میل تک پھیلی ہوئی دھرتی تو ایک چٹیل میدان ہے ۔ آسمان تک جیسے میں اکیلا ہی بچ رہا ہوں اس پر ۔ اور وہ کالی آنکھیں اور اُنکو چھپائی ہوئیں وہ کالی کالی لمبی پلکیں ۔ سوچا آخر اُن پر میرا بس کیا ہے ۔ ؟ کچھ اُن سے بھلا میرا

تعلق کیا ہے ؟ کچھ بھی تو نہیں ۔۔۔ لگتا ہے میرے لیئے یہاں سب کچھ بگڑ گیا ہے
حجرے سے نکل کر وہ کنویں کی طرف چلا گیا۔ وہاں پانی پیا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔
پیچھے قبرستان ہے پھیلا ہوا۔ یہاں سے وہاں تک۔ سامنے سرائے ہے گری
پڑی۔ قدیم ویران، بوسیدہ ۔۔۔ کوئی بھی تو نہیں لوٹا ابھی منڈی سے۔ ابھی
تو جھٹپٹا بھی کچھ دور رہی ہے۔ پھر جا کر اپنے حجرے میں لیٹ گیا۔ اور طے کرنے
لگا ۔۔۔ " چلا جاؤں گا یہاں سے۔ کیسا بدمزہ ہے دل آج ۔۔۔ کیا چاہیئے مجھے
کچھ سوجھتا نہیں ہے۔ کیا چاہیئے مجھے ؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ چلا جاؤں گا یہاں
سے ۔۔۔ کھلی چھت سے اُس کا حجرہ ابھی روشن تھا اور سرائے بھی روشن تھی اُدھر۔
اُدھر اچانک جیسے کوئی دوڑتا ہوا آ گیا۔ اُس کے حجرے کی طرف۔ اس سے پہلے
کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، سامنے کوئی کھڑا تھا ۔۔۔ وہی کالے پتھر کی مورتی ۔ وہی کالی' کالی
آنکھیں اور کچھ روشنی پھوٹتی ہوئی اُن سے ۔ سوداگر تو جیسے حیرت کے مارے اٹھ
کھڑا ہوا۔

" ارے، تم، یہاں !! "۔

اُس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ وہیں فرش پر بیٹھ گئی ۔۔۔ اُس کا سانس پھولا ہوا
تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب سا خوف تھا اور اُس میں شرم و حیا کے رنگ بھی
تھے۔ وہ دو پل صرف اُس کو دیکھتی رہی اور پھر نظریں جھکا لیں۔ لگتا تھا آنکھوں میں
اُس کے جتنے آنسو ہیں اُن سے زیادہ اُس کے اندر اندر اُمنڈ رہے ہیں۔ آنسو تو
اُس کی سوچ بچار کے دھاروں میں ہیں اور اُس کی آواز میں بھی ۔۔۔ ایک خوف بھی
زبان کو جکڑے ہوئے ہے ۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ آج کس بات کا اُس کو
اتنا خوف ہے ؟ ایک بار اپنے اندر ہی اندر وہ لرز گئی۔ اُس کے کانپتے ہاتھ
سوداگر کے قدموں کی طرف بڑھنے لگے اور سوداگر کے ہوش اُڑنے لگے ۔ اُس نے

اپنا ہاتھ بڑھا کر اُس کی کلائی تھام لی ۔
بڑی دھیمی اور کانپتی آواز آئی کالی مورت کی ــــ "مجھے تو اپنے آپ پر بھروسہ نہیں لیکن تم پہ ہے ۔" مرد نے اپنا سر جھکا لیا ۔ چپ تھا وہ، جیسے زبان کچھ نہیں کہہ سکتی ۔ کالی مورتی نے اُس کی طرف نظر اُٹھائی ۔ کیا نظر آیا ہوگا ۔ اُس کی آنکھوں میں تو صرف آنسو ہی آنسو تھے ۔ وہی آنسو اُس کی آواز بن گئے ۔ اُس نے انہی آنسوؤں میں بھیگی آواز میں کہا ۔
"دیکھو دنیا میں تم ہی سب سے اچھے اور سچے مرد لگتے ہو ۔" چُپ ہو گئی وہ ــــ جیسے اُس کے اندر اندر ایک خیال خوف بن رہا تھا ــــ "یہ نہیں ملا تو زندگی بجھ گئی ۔"
بڑی ہی بھاری سانس لی اُس نے جیسے ایک ہمت سی آ گئی ہے اُس میں، وہ کہنے لگی ۔
"لگتا ہے کوئی پہاڑ جیسی قوت ہے" یہ دُکھ، جو مجھے برابر دھکیل رہا ہے ایک طرف جیسے کہیں کوئی جگہ نہیں ہے دھرتی پر جہاں رُک کر میں سانس لے سکوں ۔ ہر سانس کلیجے سے ایسے اُٹھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو ۔ "چیخ پڑ ــــ چیخ پڑ ــــ" پھر وہ رو پڑی "ہاں مجھے بھی کوئی میرے اندر بار بار کہتا ہے کہ میں بھاگ جاؤں یہاں سے ــــ "کہیں بھاگ جاؤں ۔"
کالی مورتی کی تو جیسے سانس ہی رک گئی ۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کو دیکھنے لگی پھر تیزی سے وہ کہنے لگی ۔ "کہیں نہیں جانا ــــ کہیں نہیں ــــ کہیں نہیں ــــ" پھر جیسے کچھ سنبھل گئی بولی "ہاں چلو میرے ساتھ ــــ اُوپر اُس کالے پہاڑ پر ــــ ایک گپھا ہے وہاں ــــ وہاں کالے بھگوان کی مورتی ہے ۔ چلو میرے ساتھ ۔"
"ہاں چلو ــــ چلوں گا تمھارے ساتھ ۔ چلو، ہم دونوں بھگوان کی پوجا کریں گے ایک ساتھ ــــ"

کالی مورتی کی آنکھوں میں جیسے ایک چمک آ گئی ۔ اُس کی آنکھوں نے مرد کو غور سے دیکھا
مرد نے کہا۔ "چلو ابھی ہم چلے جائیں گے وہاں ۔"
"نہیں، ابھی نہیں ــــ ابھی نہیں" وہ کچھ گھبرا گئی ۔ ہر طرف دیکھا اور کہا ــــ
اچانک اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں ۔ بڑی ہی چمکتی آنکھوں سے اُس نے آسمان کی طرف
دیکھا ۔ لیکن ایک عجیب جبر اور سراشا کے بوجھ تلے اُس کی پلکیں جھک گئیں ۔ ایک خیال
جیسے اُس کے حلق میں کانٹے کی طرح اٹک گیا ــــ لگا سانس رک گئی اُس کی ــــ کیسا خیال
تھا وہ ؟
"کیا اس کلوٹی کی جھولی میں اتنا روشن، اتنا قیمتی ہیرہ ۔ جیسے سارا جگ اُس کی قیمت
ہو ــــ" اُس کی پلکوں پر نمی پھوٹ پڑی ۔ اپنا گلا صاف کیا اُس نے اور بڑے ہی کھلے
الفاظ میں پھر کہنے کی کوشش کی ــــ "دیکھو ــــ ابھی نہیں ــــ ہاں ــــ میں تم کو لینے
آؤں گی ــــ میں بتاؤں گی تم کو میں کب آؤں گی ــــ دیکھو ــــ نہ تم مجھے جانتے ہو
نہ میں تمہیں جانتی ہوں ۔ یہاں تم کو تو کوئی نہیں جانتا ۔ لیکن یہاں اس بستی میں مجھے
سب جانتے ہیں ۔ بتاؤں تم کو، کبھی کوئی میری طرف نیزہ بھالا اٹھائے دوڑتا ہوا آتا
ہے کبھی کوئی اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا آتا ہے میری طرف ــــ برچھی اٹھائے، جیسے لاؤ لشکر
لیتے دوڑتا ہے میری طرف ۔ وہ تلجا کیدار، ڈھور ڈنگروں کا پالا ہوا ۔ اپنا بھالا اٹھا کر
کہتا ہے مجھے ۔" تو میری نہیں تو کسی کی بھی نہیں ــــ میں نہیں مروں گا ساری بستی
والوں کو مار ڈالوں گا ۔" یہ کہہ کر اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا، دندناتا ہوا ۔ گذر جاتا ہے
مرد نے پھر اُس کی کلائی کی طرف ہاتھ بڑھایا ۔ اس بار جیسے وہ چیخ پڑی ــــ
"نہیں ــــ نہیں، تم مجھے ہاتھ نہ لگانا ۔ کیسے کہوں تم سے، کیسا کہوں تم کو ــــ پر یتم ــــ
پریتم کسے کہتے ہیں ۔ پریتم تو بھگوان کو کہتے ہیں نا ــــ میں آؤں گی تمہارے پاس،
تمہارے چرن چھونے ــــ تب تم میرا ہاتھ اس طرح تھام لینا جیسے ایک ہیرا، اپنی

جڑوں سے دھرتی کو پکڑ لیتا ہے ۔۔۔ جیون بھر کے لئے ہے نا ۔۔۔ ؟

لیکن پھر وہ ہر طرف گھبرائے ہوئے انداز میں دیکھنے لگی ۔ پھر کہا ۔۔۔"

لیکن ۔۔ لیکن ۔۔۔ تم ، ہاں تم چلے جاؤ نا یہاں سے ۔ کہیں چلے جاؤ ۔ کہیں دور چلے جاؤ ۔" یہ کہتے ہوئے سانس ٹوٹ رہا ہے میرا ۔ لیکن میں کہہ رہی ہوں جاؤ یہاں سے ۔ چلے جاؤ ۔۔۔ جاؤ ۔۔۔ ایک کالی کلوٹی عورت کا دل ایک پتھر ہوتا ہے کہ وہ یہ بات کہہ بھی سکتی ہے ۔ جاؤ ۔۔ جاؤ ۔ وہ تیزی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور بھاگ نکلی وہاں سے ۔۔۔ اُس رات کی جیسے صبح ہو گئی ہر طرف روشنی ہی روشنی ۔۔۔ پر وہ کہیں نظر نہیں آئی ۔ سوداگر نے سوچا" کیا ہو گیا ہے مجھے ؟ کہاں ہوں میں ۔۔ کچھ سوجھتا ہی نہیں ۔۔ یہ بھی جیسے ایک چھلاوا ۔ وہ بھی تھی ایک چھلاوا ۔ ساری زندگی ہی چھلاوا ۔ اُس کو اپنے سر پر، اپنے دل پر ۔ اپنے سارے وجود ہی پر ایک ایسا بوجھ محسوس ہونے لگا کہ اُس کو وہ کہیں اُتار کر رکھ سکے، نہ اُسے سہہ سکے ۔

صبح کی ٹھنڈ کو میں کنوئیں کی طرف نہانے چلا گیا ۔ اُس سارے ماحول کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورتا رہا ۔

شام ہو گئی ۔ پھر ساری سرائے کا اندھیرا اُس کے اپنے نیم چھت والے حجرے کی طرف بڑھتا ہوا لگا ۔

وہ اُس کے اوپر لادے ہوئے، اُس کو نظر نہ آنے والے بوجھ سے نڈھال ہو گیا ۔

اچانک جیسے اُس کے حجرے کی کچھ بچی ہوئی، جو آدھی چھت تھی وہی گر پڑی دھڑام سے ۔ ہر طرف گرد ہی گرد ۔ دھول ہی دھول ۔ لگا جیسے گری چھت کا ملبہ بھی سسکیاں لے رہا ہے ۔ اُدھر دیکھا اُس نے ۔۔۔ وہی کالا پتھر ۔۔ کالی عورت اُس کے پیروں پر

اِس طرح گر پڑی ہے جیسے اُس کا سارا بدن لرز رہا ہو۔ اُس کے بے طرح کانپتے ہوئے ہاتھ اُس کے پیروں پر تھے۔ ٹھنڈے ــــ اُس کی آنکھیں بھی پتھرائی ہوئی تھیں اُس کی زبان بھی پتھر۔ اُس کو سنبھالنے کے لئے وہ جھکا۔ اُس کالی مورتی نے زیادہ مضبوطی سے اُس کے پیروں کو جکڑ لیا۔ مرد نے اُس کو اپنے بازوؤں میں اُٹھانے کی کوشش کی تو وہ کانپ گئی۔ اُس کے پیروں سے ایسے لپٹ گئی جیسے اب وہی ایک مضبوط سہارا ہو اُس کی زندگی کا' اور کچھ نہیں۔ وہ لرز رہی تھی۔ سر سے پیر تک کانپ رہی تھی۔

اُس کا سارا وجود مرد کے قدموں میں تھا۔ مرد کی آنکھوں میں بھی جیسے اب کانپتے اندھیروں جیسا خوف تھا ــــ یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہے ــــ!

وہ کالی مورت پھر آنسوؤں سے بھری اپنی آنکھوں کو اُس کے پیروں پر رگڑنے لگی ــــ مرد نے پوری کوشش کی کہ اُس کو اپنی باہوں میں لے کر اپنے سینے سے لگا لے اور پوچھے ــــ "یہ سب کیا ہے ــ؟"

اُسے اس کی بھیگی آنکھوں سے اور کانپتے ہونٹوں سے اتنا ہی جواب ملا۔

"چلو ــ ابھی چلو۔ میرے ساتھ ــــ میں تم کو لینے آئی ہوں ــــ ابھی۔ ہاں ابھی ــــ ہاں چلو' ابھی ــــ"

"لیکن ابھی' اِس وقت اِس رات میں کہاں جائیں گے ہم ــــ اور کیسے؟

کالی مورت کچھ نہ کہہ پائی۔ پھر اپنی آنکھیں اور اپنے ہونٹ اُس کے پیروں پر رگڑنے لگی اور اپنی نہ سنبھلنے والی ہچکیوں میں بہ مشکل کہنے لگی۔

"کچھ مت پوچھو ــــ کچھ مت کہو ــــ ابھی اسی گھڑی ہم چلے جائیں گے دُور جنگلوں کی طرف۔ تمہارا سارا سامان میں باندھ کر لے چلونگی ــــ میں ڈھولونگی ابھی ــ بس ابھی ــ اِس بستی سے ہم کو دور نکل جانا ہے۔ بس آج ہی کی رات۔

اِسی گھڑی میں تم کو لیکر اِس بستی سے دور نکل جاؤں گی۔

"آخر کیوں؟"

جیسے اچانک وہ سر سے پیر تک کانپ گئی۔ اُس کے ہونٹ اور بھی زیادہ کانپنے لگے۔ اس کی آواز رکنے لگی۔ جیسے ایک شدید خوف اُس کے سینے کا ایسا بوجھ بن گیا ہے جس کو وہ سہار نہیں سکتی۔ اچانک وہ اُٹھ بیٹھی۔ مرد کے پیروں کو پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا ـــ اور کہا۔

"بات ـــ بات یہی ہے کہ وہ میری جان کا دشمن، وہ بھیڑیا نما کیدار ـــ اُس کا خون ہو گیا ـــ

"خون ـــ، خون!! کیسے؟" مرد کی زبان لڑکھڑا گئی۔ وہ بولی ـــ" وہ جان گیا تھا کہ میں تمہاری ہو گئی ہوں۔ اور وہ تمہارا خون کرنے والا تھا ـــ وہ بات ـــ وہ بات اُس باؤلی بنجارن کو معلوم ہو گئی تھی۔ وہ جنگلی جوانی ـــ گاؤں گاؤں بھٹکنے والے قافلے کی تیز چھری جیسی کنیا۔ وہ سب کچھ جان گئی۔ اُس نے اُس بھیڑیئے کیدار کو، تمہارے، میری جان کے دشمن کو ختم کر دیا۔ آج شام کتنا گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ وہ دیوانی چمکتی بجلی کی طرح گئی کیدار کے پاس اور کڑکی۔

"ڈرپوک ـــ تیرے لیئے آئی ہوں۔ تیری ہونے" وہ تو دارو پی رہا تھا۔ وہ اُس کی طرف لپکا، کہتے ہوئے ـــ" ہرا نا بہ مرد ـــ پہاڑ جیسا۔" جوانی چٹان جیسی ہو تو وہ مرد سچا۔"

وہ ایسے چمک اُٹھا جیسے اُس کے اندر بھی ایک بجلی کوند گئی ہو ـــ اور اُس کے چاروں طرف بجلیاں چمک گئیں ہیں۔ وہ اُس پر جھپٹا۔ تو وہ کڑکتی بجلی کی طرح اُس کے پتھر جیسے سینے پر گر پڑی ـــ ٹھہر ـــ مجھے بھی سے دار دُ ـــ پھر دیکھ میری نظروں ہی میں نہیں، میری بوٹی بوٹی میں بجلی چمکتی دیکھے گا تو۔"

وہ پتھر جیسے ٹوٹ گیا۔ اُس نے بڑی ہی چمکتی نظروں سے اُس کو دیکھتے ہوئے اُسے داد دی اور بولا۔ "تُو کھودا انگار جیسی دارو ہے"۔

وحشی جوانی نے پی لی دارو۔ ایک شعلے کی طرح لپک کر اُس مرد کے پتھر جیسے سینے سے چمٹ گئی۔ ایک دیوانے پن سے اُس سینے میں سما جانے کے انداز سے اور زیادہ زور سے اُس کو لپٹ گئی۔

وہ ہتھیار۔ کیدار چپ ہے اب اُس وحشی جوانی کی نظروں میں دارو بھی تھی لال لال۔ جوانی کے بھڑکتے شعلے بھی تھے لال لال۔ اُس پر اُس کی چھری جیسی جوانی کی دھار چمکتی دمکتی ہوئی۔ مرد بے قابو ہو گیا۔ سامنے ایک ننگی ننگی جوانی جیسے کڑک گئی۔ اور اُس کی ننگی چھری کیدار کے ننگے پیٹ میں تھی۔ پھر دیکھتے کے دیکھتے گرتی بجلی کی طرح اُس کے سینے میں تھی وہ چھری۔ اور دونوں خون کے فواروں میں۔ وہ گرج کر چمک اُٹھا۔ اُس نے اُس سے وہ چھری چھین لی اور اُس ننگی جوانی کو نیچے سے اوپر تک کاٹ ڈالا ایک ہی وار میں — اور پھر ہر طرف خون ہی خون — خون ہی خون۔ اُس پہ ایک اور وار کرنے کو وہ مرد اُٹھا تو دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا ہاتھ اُٹھنے سے پہلے وہ ڈھیر ہو گیا — ڈھیر ہو گیا —"

"چلو — چلو —"

وہ کالی مورت رات کی ساری سیاہیوں سے بنی ہوئی لگی۔ کانپتی ہوئی۔ اپنی ہی چیخوں کو اپنے اندر دباتی ہوئی۔"

چلو — چلو۔ میں تم کو لینے آئی ہوں۔ ہم یہاں سے نکل کر بھاگ چلیں۔ ابھی۔ ابھی۔ اب سارا گاؤں ہمارا دشمن ہے چلو — چلو۔"

وہ دونوں رات کے خاموش درد کی طرح چمک گئے۔ اب وہ خوف دہرا اُس کی دھڑکتی ہوئی بے دلی بزدلی کے ساتھ، اور وہ بہکے بہکے سناٹوں کی طرح جنگل کی طرف

جا رہے تھے۔ آگے ہی آگے — نہ کہیں کوئی کھٹک نہ کوئی سانس — آخر کالے پہاڑ کے دیوتا کے پاس پہونچ گئے۔

دونوں مندر میں تھے۔ بہت ہی ہراساں، پریشاں کالی مورت نے کہا آؤ — ادھر آؤ۔ وہ دو گھڑی بھگوان کی شرن میں بیٹھ گئے۔ اپنے ماتھے ٹیک دیئے پھر کالی مورتی نے اپنا ہاتھ، مرد کے ہاتھ پر رکھدیا اور اچانک وہ رو پڑی اور آنسو بھری آنکھوں سے مرد کو اس طرح دیکھا، جیسے وہ اُس کو آخری بار دیکھ رہی ہے۔ مرد کے ہاتھ پر اپنا سر ڈھلکا دیا جیسے وہ بے حال نڈھال ہوگئی ہے۔ پھر بڑے ہی بے جان انداز میں سر اُٹھا کر مرد کی طرف دیکھا۔ پھر بھگوان کی طرف دیکھا — "بھگوان مجھے شما کرنا —" کہتے ہوئے اپنا سر مرد کے سینے پر ڈھلکا دیا۔ پھر ایک شدید کرب کے ساتھ سیدھے بیٹھ گئی۔ اور پھر مرد سے اس طرح گویا ہوئی جیسے نہ اُس کا دل ہی کچھ کہتا ہے نہ زبان کچھ کہتی ہے۔ اور سانسیں چھوٹی جارہی ہیں — مرد نے اُسے اپنے قریب کھینچا اور بولا۔

"اب ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ دُور — بہت دور — بس —"
جیسے ایک آخری سانس تھی اُس کالی مورت کے سینے میں اور وہ نکل گئی سینے سے — اُس نے کہا۔

"نہیں — نہیں — نہیں —" دیکھو میں بھگوان کے سامنے تم سے بھیک مانگتی ہوں۔ ایک بات میری مان لو — ایک بات۔ آج، اب تم یہاں سے چلے جاؤ — چلے جاؤ —" اُس نے پھر بھگوان کے چرنوں میں سر رکھدیا۔ اور اُسی طرح روتی ہوئی۔ مرد سے کہنے لگی — "بس اب چلے جاؤ — جاؤ" اِس رات اِس اندھیرے میں، آگے اُس جنگل کی طرف — بس چلے جاؤ —"

مرد نے اُس کو سہارا دیا۔ "نہیں — تم کو میرے ساتھ چلنا ہے —

ابھی ــــ"

کالی مورت نے اُس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور کہا ــــ" ابھی نہیں ــــ ابھی نہیں، تم چلے جاؤ ــــ میں نہیں جاؤں گی ــــ تم کو جانا ہے۔ جب تک تم یہاں ہو، وہ گاؤں والے مجھے مار ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ تم چلے جاؤ گے تو وہ مجھے نہیں ماریں گے۔ میں بچ جاؤں گی ــــ میں مرنا نہیں چاہتی۔ جاؤ میں اُس بنجارن کی طرح مرنا نہیں چاہتی ــــ میں بھگوان کی ہو جاؤں گی ــــ تم چلے جاؤ ــــ تم یہاں رہو گے تو میری موت بن کر رہو گے۔ تم جاؤ ــــ چلے جاؤ تم یہاں سے ــــ وہ وہ یہاں بھی آسکتے ہیں ــــ وہ کیدار والے۔ خونی ــــ" اُس نے مرد سے کہا چلو، چلو، مندر سے باہر چلو ــــ" وہ دونوں مندر سے باہر سے آگئے اُس نے کہا ــــ" دیکھو، یہ راستہ جنگل میں اُتر جاتا ہے۔ آگے چلے جاؤ جاؤ ــــ" وہ اُس کو بے طرح لپٹ گئی۔ جُھک کر اُس کے قدموں پر سر رکھ دیا ــــ" مجھے معاف کر دو ــــ معاف کر دو ــــ چلو آگے چلو ــــ"

لیکن وہ چل نہیں پا رہی تھی ــــ جیسے کچھ دیر میں وہ ٹوٹ پھوٹ کر گر جائے گی ــــ اچانک وہ جیسے آہستہ سے چیخ پڑی اور مرد کو آگے کھینچنے لگی "دیکھو، دیکھو، کوئی اِدھر آرہا ہے ــــ وہ دیکھو کوئی روشنی آرہی ہے مشعل کی ــــ چلو دوڑو ــــ بھاگ جاؤ ــــ بھاگ جاؤ ــــ اُس کو ساتھ لیتے وہ آگے چلنے لگی۔ جنگل کی طرف۔ اُدھر آتی ہوئی مشعل نظر آنے لگی دونوں تیزی سے اُتر گئے پہاڑی کی طرف ــــ اُدھر وہ کہیں اندھیرے جنگل میں گر پڑی ــــ وہ مرد پلٹا ــــ لیکن اُسے ایک کمزور سی، خوف زدہ آواز سنائی دی "آگے چلے جاؤ"۔ وہ مرد تیزی سے وہیں کہیں جھاڑیوں میں آگے چلتا ہوا غائب ہو گیا۔

مشعل کی روشنی، مندر تک آئی، پھر مندر سے باہر اِدھر اُدھر نظر آئی۔ پھر آگے ایک ٹیلے پر نظر آئی اور غائب ہو گئی۔

جب اُس کالی مورت کو لگا کہ وہ ابھی ہوش میں ہے۔ وہاں سے اُٹھ کر اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ جنگل ہی جنگل تھا۔ نراشا کا۔ یا پھر موت کا، اندھیرا ہی اندھیرا۔

شدید ترین غم ایک یقین کا کھو دیا اُس کو۔ جس کے بارے میں وہ کس قدر گھور اندھیرے جیسے خوف سے سوچتی تھی کہ وہ گیا تو زندگی گئی۔ ان اندھیروں میں کتنی دور دور تک ٹھہرا ٹھہرا لگا وہ دُکھ۔ جیسے کوئی ایسی بھی ایک ٹیس ہوتی ہے۔ جس کو موت ہی کہتے ہیں اور اب جیسے موت اُس کے سارے جسم کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ رہی ہو۔ اچانک جیسے اُس کی آنکھوں کے دیدے پھٹنے لگے۔ ساری دھرتی سارا جنگل آسمان کی طرح سفیدیوں میں ڈھلنے لگا۔ کس طرح کوئی آواز نکلے اُس کے حلق سے۔ نہ کوئی آواز نہ، نہ کوئی نظر کی روشنی۔ جانے کیا کچھ ہو گئی تھی وہ، وہ جیسے اپنی موت ہی کے سہارے مندر تک پہونچ گئی اور بھگوان کے چرنوں میں بے دم ہو کر گر گئی۔ بھگوان پر نظر پڑی تو ہلکی سی آواز اُس کے حلق سے نکلی۔ "بھگوان کیسی کرپا ہے تیری۔ کتنا بڑا اُپکار، جیسے دوسرا جیون ہی دے دیا مجھے۔ میرے دیالو بھگوان تو نے آخر لاج رکھ لی میری۔ میرے پیار کی۔" اُجالے ہیں میرے اندر۔ کتنی خوشبوؤں کی روشنی ہے۔ اُس بنجارن نے اپنی جان دیکر بچالیا! اُس جان و جگر سے پیارے سوداگر کو۔ بنجارن کا پیار کتنا مہان تھا۔ میرا پیار بھی مہان ہے میرے بھگوان۔ وہ روشنیوں کے دیش سے آیا تھا۔ مجھ کالی کلوٹی کے جیون میں۔ کتنی روشنیاں دے گیا آج سب کچھ دیکھ رہی ہوں میں۔ اُنہی روشنیوں کے راستے وہ واپس جا رہا ہے۔

اُسے اِن اندھیروں کے جنگلوں سے دُور کر دیتا۔ میری جان لے لے اور دُور بہت دُور اُسے کہیں پہونچا دے۔ میرا پیار بھی کتنا مہان ہے۔ بھگوان ؟

اب اُس رات کے اندھیروں میں، جنگل کے اندھیروں میں مندر کے اندھیروں میں ـــــ دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ آرہا تھا ایک سویرا، اپنا سر جھکائے ہوئے، کچھ تھکا تھکا سا لگتا تھا۔

اُس تھکے تھکے سویرے نے ہلکی روشنی دینے والی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ کالی کلوٹی مورت، وہ "کنیا" بھگوان کے چرنوں میں کب کی ڈھیر ہو چکی ہے، نہ آنکھوں میں کوئی جوت، نہ ماتھے پر کوئی رنگ، ایک پتھر پر پڑا اُس کا سر لہو لہان تھا ـــــ اور وہ تھکا ہوا سویرا، مندر سے نکل کر باہر ہر طرف دیکھ رہا تھا ـــــ ہر طرف ـــــ

لیکن اس جنگل کو کچھ خبر نہیں ہو پائی تھی کہ وہ سرخ و سبز جنگلوں کی جوانی لے کر جو آیا تھا اِدھر، وہ پتھروں کا سوداگر رات بھر سو چتا رہا تھا اِس تاریک جنگل میں ـــــ "میں ایسا کیوں محسوس کر رہا ہوں کہ میں کہیں نہیں جا سکتا۔ میرے سامنے تو راستہ ہے، چل پڑوں اُس پر، جان بچ جائے گی میری، اِس گھڑی یہاں سے، اب جان بچا کر نکل جانا کتنا آسان لگتا ہے ـــــ رات ہے، اندھیرا ہے، گھنا جنگل ہے۔ اِن حالات میں، یہ کتنے محفوظ راستے ہیں لیکن مجھے بار بار کیوں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہاں سے چلے جانا میرے بس کی بات نہیں ـــــ وہ ایک بنجارن نے، جنگل کی ہواؤں کی طرح آزاد بے مہر جوانی نے، مجھ پر اپنا سب کچھ لٹا کر، آج میری جان بچانے کی خاطر بس جیسے دو گھڑی میں فیصلہ کر لیا اور بنا کچھ سوچے سمجھے اپنی جان دیدی، اپنی زندگی ختم کر لی ـــــ یہ سب کیا ہے ؟ یہ سب کیوں ہوا ؟ ـــــ اور میں اب

مشعل کی روشنی، مندر تک آئی، پھر مندر سے باہر اِدھر اُدھر نظر آئی۔
پھر آگے ایک ٹیلے پر نظر آئی اور غائب ہو گئی۔
جب اُس کالی مورت کو لگا کہ وہ ابھی ہوش میں ہے۔ وہاں سے اُٹھ کر اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ جنگل ہی جنگل تھا۔ نراشا کا۔ یا پھر موت کا، اندھیرا ہی اندھیرا۔
شدید ترین غم ایک یقین کا کہ کھو دیا اُس کو۔ جس کے بارے میں وہ کس قدر گھور اندھیرے جیسے خوف سے سوچتی تھی کہ وہ گیا تو زندگی گئی۔ اِن اندھیروں میں کتنی دور دُور تک ٹھہرا ٹھہرا لگا وہ دُکھ۔ جیسے کوئی ایسی بھی ایک ٹیس ہوتی ہے۔ جس کو موت ہی کہتے ہیں اور اب جیسے موت اُس کے سارے جسم کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ رہی ہو۔ اچانک جیسے اُس کی آنکھوں کے دیدے پھٹنے لگے۔ ساری دھرتی سارا جنگل آسمان کی طرح سفیدیوں میں ڈھلنے لگا۔ کس طرح کوئی آواز نکلے اُس کے حلق سے۔ نہ کوئی آواز نہ، نہ کوئی تنظر کی روشنی۔ جانے کیا کچھ ہو گئی تھی وہ، وہ جیسے اپنی موت ہی کے سہارے مندر تک پہونچ گئی اور بھگوان کے چرنوں میں بے دم ہو کر گر گئی۔ بھگوان پر نظر پڑی تو ہلکی سی آواز اُس کے حلق سے نکلی۔ "بھگوان کیسی کرپا ہے تیری۔ کتنا بڑا اُپکار، جیسے دوسرا جیون ہی دے دیا مجھے۔ میرے دیالو بھگوان تو نے آخر لاج رکھ لی میری۔ میرے پیار کی۔" اُجالے ہیں میرے اندر۔ کتنی خوشبوؤں کی روشنی ہے۔
اُس بنجارن نے اپنی جان دیکر بچا لیا، اُس جان و جگر سے پیارے سوداگر کو۔
بنجارن کا پیار کتنا مہان تھا۔ میرا پیار بھی مہان ہے میرے بھگوان۔ وہ روشنیوں کے دیش سے آیا تھا۔ مجھ کالی کلوٹی کے جیون میں۔ کتنی روشنیاں دے گیا آج سب کچھ دیکھ رہی ہوں میں۔ اُنہی روشنیوں کے راستے وہ واپس جا رہا ہے

اُسے اِن اندھیروں کے جنگلوں سے دُور کر دیتا۔ میری جان لے لے اور دُور بہت دُور اُسے کہیں پہونچا دے۔ میرا پیار بھی کتنا مہان ہے۔ بھگوان ؟

اب اُس رات کے اندھیروں میں، جنگل کے اندھیروں میں مندر کے اندھیروں میں ـــ دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ آرہا تھا ایک سویرا، اپنا سر جھکائے ہوئے، کچھ تھکا تھکا سا لگتا تھا۔

اُس تھکے تھکے سویرے نے ہلکی روشنی دینے والی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ کالی کلوٹی مورت، وہ "کنیّا" بھگوان کے چرنوں میں کب کی ڈھیر ہو چکی ہے، نہ آنکھوں میں کوئی جوت، نہ ماتھے پر کوئی رنگ، ایک پتھر پر پڑا اُس کا سر لہولہان تھا ـــ اور وہ تھکا ہوا سویرا، مندر سے نکل کر باہر ہر طرف دیکھ رہا تھا ـــ ہر طرف ـــ

لیکن اس جنگل کو کچھ خبر نہیں ہو پائی تھی کہ وہ سرخ و سبز جنگلوں کی جوانی لے کر جو آیا تھا اِدھر، وہ پتھروں کا سوداگر رات بھر سوچ رہا تھا اِس تاریک جنگل میں ـــ "میں ایسا کیوں محسوس کر رہا ہوں کہ میں کہیں نہیں جا سکتا۔ میرے سامنے تو راستہ ہے، چل پڑوں اُس پر، جان بچ جائے گی میری، اِس گھڑی یہاں سے، اب جان بچا کر نکل جانا کتنا آسان لگتا ہے ـــ رات ہے، اندھیرا ہے، گھنا جنگل ہے۔ اِن حالات میں، یہ کتنے محفوظ محفوظ راستے ہیں لیکن مجھے بار بار کیوں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہاں سے چلے جانا میرے بس کی بات نہیں ـــ وہ ایک بنجارن نے، جنگل کی ہواؤں کی طرح آزاد، بے مہر جوانی نے، مجھ پر اپنا سب کچھ لٹا کر، آج میری جان بچانے کی خاطر بس جیسے دو گھڑی میں فیصلہ کر لیا اور بنا کچھ سوچے سمجھے اپنی جان دیدی، اپنی زندگی ختم کر لی ـــ یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کیوں ہوا ؟ ـــ اور میں اب

یہاں ہوں ـــــ ان اندھیروں کی پناہ میں ـــــ اِس لئے کہ اپنی جان بچانے کے لئے یہاں سے بھاگ نکلوں ـــــ اور وہ دوسری کنیا، وہ کالی مورت! اُس نے بھی اپنی جان پر کھیل کر مجھے محفوظ محفوظ، یہاں تک ساتھ لاکر، مجھے بھاگ جانے کا راستہ تک بتادیا ـــــ کون ہیں وہ دونوں ـــــ کون ہیں؟ اور میں ایک مرد ـــــ ایک مرد ـــــ مرد ـــــ مرد!

کیسی گھڑی ہے یہ؟ ایک سچی گھڑی ـــــ کیسا راستہ ہے یہ؟ ایک سچا راستہ ـــــ جنگل کی ہواؤں میں ـــــ زندگی کی بے باکی میں ـــــ نڈرپن میں شاید کوئی چیز محفوظ نہیں رہ سکتی، سوائے سچ کے ـــــ

ایک بار خود دیکھوں، اُس زمین کو اپنی آنکھوں سے، جہاں ایک سچی دیوانگی نے اپنا خون بہا دیا ـــــ اپنی جان دے دی ـــــ میری خاطر ـــــ میرے لئے ـــــ

وہ جیسے پھٹ پڑا، ایک چیخ بن کر ـــــ ایسی چیخ جو ایک پیڑ نے بھی نہیں سنی ہوگی ـــــ لیکن اُس سے سارا جنگل لرز گیا ـــــ

وہ بھی تو صحراؤں کا پالا تھا ـــــ چل پڑا وہ ـــــ مندر کے راستے سے کچھ ہٹ کر، ایک دوسرے راستے پر ـــــ واپس اُسی گاؤں کی طرف ـــــ اپنی اُسی سرائے کی طرف ـــــ اُسے یقین تھا وہ کالی مورت بھی ایک بار ضرور آئے گی وہاں ـ وہاں ایسی کیفیت میں جس کا شاید کوئی نام نہیں ہوتا ـــــ

لیکن ـــــ لیکن ـ اُس رات کے تھکے تھکے سویرے نے دیکھا کہ اُس سرائے کے احاطے میں کچھ لوگ جمع تھے ـــــ اور اُن سے قریب پتھروں کا وہ سوداگر زمین پر بے سدھ پڑا ہوا تھا ـــــ اُس کے سینے میں ایک چھرا پیوست تھا اور اُس کا خون وہاں زمین میں جذب ہو چکا تھا ـ جانے کتنے گھاؤ تھے!

اُس آہوئے صحرا نے، اس لیے گھر وحشی جوانی نے اور وہ سیاہ چٹانوں میں تراشی ہوئی، موتیا موگرے کی کچی کلیوں سے سجی جوانی نے پتہ نہیں، انسانی تہذیب کے کس مردہ و بے جان دھارے کے دیئے ہوئے ایک احساسِ وفا و دیانت کی خاطر اپنی جان دے دی تھی۔

÷

سبق :۔ تہذیب نہ تو شہر میں ہوتی ہے نہ گاؤں میں نہ جنگل میں، تہذیب تو صرف انسان کی فطرت میں ہوتی ہے ـــــ باہر تو صرف سنگ و خشت اور چونے، مٹی گارے کے بنائے ہوئے گھروندے ہوتے ہیں جن کو ہم تہذیب بھی کہتے ہیں اور تمدن بھی ـــــ

۳۰

بہتی ریت ٹھہرا پانی

اُس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا اس طرح جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے یہاں پہونچی ہو
کچھ دیر اُس نے اپنا سر نہیں اُٹھایا۔ میں اس کے قریب چپ چاپ کھڑا تھا
اپنے سینے سے لگے۔ اُس کے سر کو دیکھتا ہوا۔ لگا اُس کو اُس کی جسمانی تھکن کا کوئی احساس
ہی نہیں تھا۔ وہ تو جیسے چاہتی تھی، تھکن سے چور اُس کے ذہن کو کہیں دو گھڑی سکون
مل جائے، بس کوئی ایسا مقام مل جائے ـــــ میں نے اُس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
پھر آہستہ سے اُس کے شانے پر بھی، کہ شاید اس طرح اُسے میری قربت کا احساس
یا یقین ہو جائے۔

اُس نے اپنا سر اُٹھا کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں اُس کی آنکھوں میں پھیلے
صحرا کو مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ وہ آنکھیں جن میں کبھی سال کا ہر موسم بہاروں کی طرح
لہلہاتا ہوتا تھا۔ اب تو اُن میں بس ریت کے بگولے تھے۔

اُس نے مجھ سے ایک بجھتی شمع سے اُٹھنے والے دھوئیں جیسے لہجے میں پوچھا
”کیا دیکھ رہے ہو ؟ یہی نا کہ آنسو کیوں نہیں نکلے ؟“

اُس نے سر جھکا لیا۔ یہ یقین دلاتے ہوئے کہ آنسو بھی تو بگڑی تقدیروں کی
طرح کسی کو مل جاتے ہیں۔

ایک موہوم سی مسکراہٹ کا انداز آگیا اُس کے چہرے پر جس میں یہ اظہار بھی تھا کہ پھر بھی کسی کومل تو جاتے ہیں آنسو — یہاں تو وہی آنسو اُس ذہن کی ہر گھڑی تپتی بھٹی ہیں، ہر موسم کی شہ پاکر اِس طرح جلتے کھولتے رہتے ہیں کہ آخر کسی کیمیا گر نے اُس بھٹی میں وہ زہر تیار کرہی لیا جو ایک بار جسم میں سرایت کر جائے تو پھر کبھی اُس کو باہر نکلنے کی کوئی راہ نہیں ملتی۔ ہر راہ دری بند — سیل بند۔

اُسے تو وہی ذہن ملا تھا جو ایک مسلسل تپنے والی بھٹی ہوتا ہے جس کا ایندھن سوکھی سوکھی آشاؤں، آرزوؤں کی گھاس اور ہر گھڑی گھُٹ گھُٹ کر بے جان ہونے والی تمناؤں اور ارمانوں کی بے رس کونپلیں ہوتی ہیں —

کتنی نیلی نیلی پہاڑیاں تھیں اور اُن کے بیچوں بیچ ہلکی سرمئی فضاؤں میں نظر آنے والی سبز و سرخ وادیاں، ایسے لگتا تھا کہ اُن نیچی اُونچی پہاڑیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، بہت دُور سمندروں کے ساحلوں سے آگے تک پھیلا ہوا — سلسلہ سیادری پربت جیسا۔

اُس علاقے کی وادیاں سرخ و سبز اِس طرح تھیں کہ سرخ پھول والے بے شمار پیڑ دُور تک پھیلے ہوئے نظر آتے تھے اور ساتھ ہی وہ مُونگ، مٹر اور ارہر کے بڑے ہی ترو تازہ سرسبز کھیت تھے اور اِدھر اُدھر بنی ہوئیں چھوٹی، چھوٹی شفاف جھیلوں میں مُرغابیوں کے غول، جو اُن وادیوں میں بنے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گذرنے والے مسافروں کو یقین دلاتے کہ یہاں سارے پنچھی پکھیرو آزاد ہیں۔ چاہو کسی سمت اُڑ جاؤ۔ پچھم پورب، اُتر، دکھشن، اِدھر شکاری تو آتا ہے مگر اپنے تیر کمان نہیں لاتا ساتھ۔

اُن نیلی پہاڑیوں کی نیلی نیلی وادیوں میں اُنہی ٹیڑھے، میڑھے راستوں سے وہ چلی جایا کرتی تھی۔ کبھی اِس سمت سے اُس سمت، کبھی اُس سمت سے اِس سمت، اُنگلی میں بیٹھی ہوئی۔ اِس پہاڑی کے پیچھے بہن کا گھر تھا۔ اُس پہاڑی کے ڈھلوان پر بھائی کا گاؤں۔ پھر دُور دُور تک پھیلے ہوئے وہ کھیت اور وہ جھیلیں۔ ذرا

زیادہ اُدھر اُتّر کی طرف نکل جاؤ تو دور ہی سے نظر آجانے والا وہ چھوٹا سا قریہ، جہاں کوئی بھائی بند تو نہیں تھے، لیکن سبھی اپنے تھے۔ وہاں کبھی پہونچ جاؤ تو پورا ایک دن گذارنا ہو۔ دوسری صبح سے پہلے واپس جانا تو دنیا میں کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

وہاں تو بگھی کے گھوڑوں کی بھی اتنی آؤ بھگت ہوتی کہ نکلتے سمے وہ بگھی میں جُتنے سے انکار کر دیتے اور اَڑ جاتے کہ "نہیں چلیں گے"۔

پھر جب علاقے کے باغ باغات سے پھل پھلاری اُتار لیئے جاتے اور کھیتوں کی فصلیں کٹ جاتیں تو گوداموں میں اُنکی سوگند پھیلنے پھیلنے تک ہلکی ہلکی پروائی سنکنے لگ جاتی ـــ اور ساری وادیوں میں چلنے والی ٹھنڈی ہوائیں زیادہ مسرور لگتیں کہ اب اُن کو چھٹی ملنے والی ہے اور اب گرم ہواؤں کے موسم آنے والے ہیں۔

ضلعوں اور شہر کے اسکول اور کالج بند ہو جاتے اور وہ اپنی بگھی کے گھوڑوں کو بھی چھٹی دے دیتی کہ بس اب کہیں نہیں جائیں گے۔

اسکولوں اور کالج سے یہاں آنے والوں میں تین چار تھے، اسی کے ہم عمر اور سب اُس حویلی والے گھر میں چھٹیاں گذارنے والے سبھی تھے۔ نیرنگ باز، گپ باز اور لال بجھکڑ ـــ سب اپنے ہی تو تھے، لیکن ایک جو بڑا ہی دُبلا پتلا تھا، سر سے پیر تک ایک ہی ہڈی پر منڈھا ہوا، وہ سب سے پھرتیلا تھا۔ زیادہ کھلنڈرا، بڑا ہی ہنسوڑ اور پُرشور ـــ اور دوسروں کی طرح نہ کسی کا عزیز نہ قرابتی ـ

لیکن سب سے زیادہ اپنا حق جتانے والا۔

جب وہ موسمی پھل پھلاری سے اُنکی تواضع کرتی تو سب اُس کو اپنے اپنے اسکول اور کالج کے قصّے سناتے رہتے اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے

اور جب وہ دُبلا پتلا ہنستا ہی چلا جاتا اور رُکتا ہی نہیں تو وہ اُسے گھورنے جاتی ۔ بالکل چُپ چاپ ۔ تو وہ بڑی ہی بے تکلفی سے اُس کے جسم میں اپنی انگلیوں سے بے طرح گُدگُدی کرنے لگ جاتا، تب وہ بھی لوٹ پوٹ ہو جاتی ۔

ایک بار اُسی گھر کی چھت پر بنے کمرے میں، اُس ہلکی گرم رات میں جھیل سے آنے والی، ذرا سی ٹھنڈک لی ہوئی، ہواؤں میں جب وہ سب سو چکے اور اپنے خوابوں میں کھو گئے تو وہ چپکے سے اُٹھی اور اُن سب کو دیکھا ۔ "کتنے بڑے ہو گئے ہیں سب، کالج کی عمر کے بھرے پُرے ۔ لیکن وہ دُبلا پتلا ۔" وہ بھی تو لمبا تڑنگا لگتا ہے ۔" اُس پر اُس نے غور کیا تو سوچا ۔ "یہ تو اِس لالٹین کی روشنی میں بھی مدھم سا نظر پڑتا ہے ۔ سویا ہوا ہو نا ۔"

تب کھلی کھڑکی سے اُس نے جھیل کی طرف دیکھا اور پھر اپنے بستر کی طرف لوٹ آئی ۔ ایک سوال وہ اپنے آپ سے بار بار پوچھنے لگی ۔ "اِن سب میں اُس کا کون ہے ؟ اُس کا اپنا کون ہے ؟ ۔ کون ہے ؟" ۔

بار بار اُس کے ذہن میں اُٹھنے والا یہ سوال ہی اُس سے پوچھتا ۔ "اِس سوال کا جواب طے کرنے کے بعد بھی، یہ سوال کیوں کرتی ہو اپنے آپ سے ۔ ؟ سوال بھی وہی ۔ جواب بھی وہی ۔"

اُسے اُس بات پر ہلکی سی ہنسی آ گئی تھی کہ اِس سوال کا جواب تو اُس کی نظروں کے سامنے ہے، وہاں، قریب ۔ مسجد کے اُس صاف سفید پتھر کے بنے ہوئے مینار جیسا ۔ کبھی کبھی نہ ملنے والا ۔ اُس کی نظروں کے سامنے ۔ اور وہ خود مسجد کی دہلیز پر بیٹھے، چُپ چاپ، اُس مینار کو دیکھ رہی ہے سنگِ مرمر کی بنی دہلیز، کتنی سخت اور کتنی سرد ۔!!"

اُس رات اُس کی آنکھیں بند نہیں ہوئی تھیں ۔ نظریں لالٹین پر لگی ہوئی تھیں ۔

اُس کی ہلکی مدھم روشنی میں اُسے، اپنی آنکھوں کے سامنے کچھ کالے کالے دھبے نظر آنے لگے۔ اچانک ایک دھبہ اُس کی آنکھوں پر جم گیا۔ یکلخت اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور گھڑی بھر بعد اُسے لگا وہ کالا دھبّہ اُس کی آنکھوں کی راہ سے اُس کے اندر اُتر گیا ہے، دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا ہے۔ اُس نے اس خیال اور اُس احساس کے ساتھ ہی اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اُس کو اُس کے اندر ایک عجیب سی تپش محسوس ہونے لگی۔ جیسے اندر ہلکی ہلکی سی ایک آگ سُلگنے لگی ہو۔

پھر وہ گرم گرم موسم چلا گیا۔ وہ سب کھیلنڈرے چلے گئے۔ اُس کی آنکھوں سے کچھ گرم گرم آنسو بھی بہہ گئے۔

پھر برکھا رُت آ گئی۔ لیکن برکھا رُت کی ہلکی ٹھنڈک بھی اُسے نصیب نہیں ہوئی۔ بس تپش ہی تپش۔

مینہ کتنا نہیں برسا ہو گا اُس رُت میں۔ لیکن اُس کے اندر کی تپش تو ایک سلگتی آگ بننے لگی۔ برکھا رُت میں تو پیڑ پات، کھیت پہاڑ سب ہرے بھرے لگتے ہیں۔ ہریالی ہی ہریالی ہوتی ہے ہر طرف۔ لیکن اُسے تو جانے کیوں وہ ساری رُت کالی لگی۔ کالی رُت ــــ مینہ برسا تو جیسے آگ برس گئی اور جھیل کے پانی کا رنگ بھی بالکل گدلا گدلا ــــ کالا کالا لگا۔

جس کمرے میں وہ سب سوتے تھے، اب وہ وہاں اکیلی سوتی ہے۔ ایک دن بڑے ہی سویرے جاگ گئی وہ ــــ وہاں کی لالٹین بجھا دی تو سوچا کہ اپنے اندر والی لالٹین کو بھی اِسی طرح کیوں نہیں بجھا سکتی وہ آخر ــــ؟ وہ کھڑکی کے پاس آئی ــــ اُس عمر کی ترا شا جب اِس طرح لالٹین بجھا کر دھندلکے میں بالکل اکیلی ہو جاتی ہے اور ایک دُبدھا بن جاتی ہے تو ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ رات اپنے سامنے سویرے کو دیکھ کر اچانک پلٹ جاتی ہے۔ پچھلی رات کی طرف

چلے جانے کو؟ پچھلی رات میں اب چاہے کچھ باقی نہ رہا ہو، لیکن وہ اب بھی رات ہی تو ہے۔ ایک ایسی شکل بنی ہوئی جو پوری کی پوری اپنی ہے۔ کیسا ٹھنڈا و شواس ہے، دل کی جلن پر اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھ دینے والا۔ یہ جی اور جی کے ارمان تو اصل میں ڈرپوک ہوتے ہیں۔ کتنا سہمے بیٹا ہے آخر اس نازک نازک، کومل کومل کونپل کو پھوٹے۔ اس کو تو ابھی پات بننا ہے۔ پھول بننا ہے پھر ایک ہرا بھرا اور رچرا پُرا پودا۔ ایسے ہی تو دھرتی کی ہر چیز دھیرے دھیرے بڑھتی ہے، تو ایک رُت بنتی ہے۔ موسم بنتی ہے ـــ ساہس بن جاتی ہے اِن کونپل جیسی کامناؤں کے لئے ـــ وہ یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ آگے سامنے سویرے کی ہلکی ہلکی کرنوں نے مسجد کے اُس مینار کی سفیدیوں کو ایک چمک دیدی ـــ وہ پتھر کا مینار کتنا مضبوط تھا! چاہے کیسا ہی موسم آجائے، کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے اُس کا۔؟

وہ کھڑکی کے پاس آگئی، کتنی نیلی نیلی تھی وہ سامنے پھیلی ہوئی جھیل ـــ اِدھر اُدھر کھلتے پھولوں کی صباحتیں لیئے وہ صبح طلوع ہو رہی تھی

اور اُس جھیل کے کنارے لال لال پھولوں والے پیڑوں سے لگے راستے سے ایک صبح رنگ گھوڑا اِدھر آرہا تھا۔ کتنا اونچا پورا تھا اُس کی پیٹھ پر لگی زین پر بیٹھا ہوا سوار! صاف نظر آتا تھا کہ بڑے ہی مضبوط جسم والا ہے وہ۔ مضبوط مضبوط پیر رکاب میں رکھے ہوئے۔ اُس گھر کے قریب آیا تو نظر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کالا کالا لباس بھی بڑا سخت تھا اُس کا۔ جیسے چمڑے کا بنا ہوا ہو۔ بڑا ہی سرخرو جوان لگتا تھا وہ ـــ سر پر جیسے اُون کی بنی انگریزی ٹوپی اور اُس میں لگا سرخ سرخ پرندے کا پَر ـــ وہ اُس کی کھڑکی کے پاس آیا تو اُس کو لگا اُس کی آنکھیں بھی سبز سبز ہیں اور اُس کے ہاتھ میں جو چابک ہے وہ پتا چلا نے بھی آواز دے سکتا ہے: "شڑاپ"

اُس گھوڑے سوار کو ویسے اُس نے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا ہزار بار دیکھ
تھا۔

وہ ہٹ آئی کھڑکی سے ــــ وہ جانتی تھی اُس کو ــ اُس پچھلی پہاڑی پہ بسے
گاؤں کا رہنے والا تھا وہ ــــ اُس کے بھائی کی سسرال کا ــ اپنے باپ کی ساز
جائیداد کا وارث ــــ اُس کا باپ تو اُس کے خاندان کے رسم و رواج ہی کا نہیں بلکہ
اپنے پُرکھوں کی حشمت و حُرمت کا بھی پاس دار تھا۔ مشہور تھا کہ اُس کے پُرکھوں نے
اپنے خاندان کی عورتوں سے دوسروں کے سامنے بات بھی نہیں کی تھی۔ بس بیٹے کا
سے کام۔ اُس کے باپ نے اپنی پہلی بیوی کو زہر دے دیا تھا۔ چپکے چپکے اور
دوسری شادی کر لی تھی ــــ اِس لیئے کہ اُس پہلی بیوی میں ایک عورت کی سیج درجہ
نہیں تھی۔ کج ادائی نہیں تھی، جو اُسے مرغوب تھی، خلوت میں ــ اور یہ خوش رو
سوار اُس کی اُسی پہلی بیوی کی اولاد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنی پہلی اولاد سے ہمیشہ
آنکھیں پھیرائیں اور کبھی بات ہی نہیں کی اُس سے۔ اور یہی وجہ تھی کہ سارے خاندان
میں یہ بیٹا پلا کہ اُس کے باپ سے ڈر کر خاندان کا ہر فرد اُس سے بے پناہ پیار کرتا
اُس کا لاڈ کرتا اور اُس کی ہر خواہش اور ہر مانگ پوری کرنا اپنا فرض سمجھتا۔

ٹھاٹھ ہی ٹھاٹھ تھے اُس کے۔ اِسی لیئے پڑھنا لکھنا اور اسکول جانا تو صرف اُس
کی مرضی پر تھا۔ ہوا یہ کہ اپنے رنگ و روغن کے ساتھ وہ گبرو بن گیا۔ بڑا ہو کر ــ کیسے ٹھسّے
سے آیا تھا اُس صبح کو اپنے سکندری گھوڑے پر ــــ

اُس دن ناشتے پر اُس نازنین کے پدرِ معظم سے اُس نے کیسے کھرے کھرے
لہجے میں اور اپنی کھر کھر جیسی آواز میں باتیں کی تھیں کہ پچاسوں باغات ہیں ــ میلوں
پھیلے ہوئے کھیت ہیں۔ دو بگھیاں ہیں، اور کئی گھوڑے اور سب کچھ ہے۔

اُس صبح کے بعد پھر جو ویسی ہی ایک صبح آئی تو کتنے ہی روشن روشن رنگوں میں

رنگی ہوئی آئی ۔۔ کتنے ہی اشہب شہزور، رنگ برنگے ریشم و اطلس کی پوشاکیں پہنے چلے آئے، باجے گاجے گونج گئے وادی میں۔ کتنی ہی بگھیاں ۔ اپنے گلوں میں گھنگرو باندھے کتنے ہی بیل، اپنی چمک دمک والی جھولوں میں پتھروں پر دوڑنے والی گاڑیوں میں لگے ہوئے ۔۔ اُن میں آنے والی عورتیں، ہنستی ہنساتیں۔ مرد جھومتے جھامتے ۔۔ اور پھر اُس صبح کی گود میں جتنے پھول تھے، اُن کی خوشبو کی ردائیں، اوڑھے ہوئے ۔

لیکن وہاں ایک لال لال پھول والے پیڑ تلے ۔ ایک کچی قبر بھی نظر پڑتی تھی ۔ جس میں راتوں رات، اُس نازنین نے، وہاں کی مٹی کھود کر اپنی گھٹی ہوئی آرزوں کو تمناؤں کو، حسرتوں کو، اور اپنی مرضی کو دفن کر دیا تھا۔ ٹھیک وہیں سے، اُسی راستے سے ساری خوشبوؤں اور نکہتوں کا قافلہ گذرا تھا جس کی ٹھنڈکوں نے اُس کے دل و دماغ میں ایک بھٹی سی روشن کر دی تھی جس کا کہیں دھواں تک نہیں اُٹھا تھا ۔۔

وہ چلی گئی اُس دوسری پہاڑی پر بنے اُس گاؤں کو جہاں اُس کے بھائی کی سسرال تھی ۔

کتنے ہی دن گذر گئے تھے ۔ بے شمار، بے حساب ۔۔

اُس نے تو بس یہی دیکھا تھا کہ ہر رات، واقعی، بالکل ایسے ہی جیسے وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو، آتا ہے، اُس تک اور اُس کو اُٹھا کر ڈال دیتا ہے، بستر استراحت پر کچھ بھی نہیں کہتا ۔ سوائے کچھ اکھڑی اکھڑی سانسوں کی سرگوشیوں کے ۔ اور صبح سویرے گرم گرم دودھ پیتا ہے، خشک میوے کھاتا ہے اور چلا جاتا ہے، اور پھر دوسری رات بھی اسی طرح آتا ہے جیسے گھوڑے پر سوار ہو، بس پھر، ہر رات کا وہی رنگ، وہی ڈھنگ، وہی مزاج اور پھر وہی صبح ۔ کتنی راتیں گذر گئیں اور کتنی صبحیں ۔ سورج وہی نکلا ۔ تارے اُسی رنگ میں طلوع ہوئے ۔ اندھیرے بھی آئے تو

کا ایک ہی رنگ، گہرا کالا۔

کتنی ہی بار اُس نے ان اکھڑی اکھڑی سرگوشیوں سے اپنی آواز ملانے کی بھی کوشش کی۔ کہیں ایک دو لمحوں کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ اور کچھ لمحے اپنی سانسوں میں بھی جکڑ لیئے۔ اور بات نہ بنی تو صبح کو دودھ پیش کرتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی، دل کے ارمانوں کے بات۔ ذہن و دل کی صحبتوں کی بات۔ ذرا سمجھنے سمجھانے والی عشق و وارفتگی کی بات۔ لیکن جب بھی اُس نے ہونٹ کھولے، ایک میٹھی سی، کچھ کہنے والی مسکراہٹ کے ساتھ! تو اُس شہسوار نے آہستہ سے اپنا چابک اُٹھا لیا اور نکل گیا وہاں سے۔ اُس نے خدا اور اُس کی قدرت کا بھی شکر ادا کیا کہ چابک کم از کم برستا تو نہیں۔ اُس کے باپ نے تو بیوی کو زہر دیدیا تھا۔

اُس کے اُس حجرے میں، اُس کے اندھیروں اور اُس کی روشنیوں میں اُس کے ایک لڑکی ہوئی اور ایک لڑکا۔ سورج، چاند، ستارے سب نکل آئے اُس کی آرزوؤں اور تمناؤں کو روشن کرنے۔

اُنکو پالا اُس نے، اُنکو اسکول بھی اُسی نے بھیجا۔ بس اُنکے اسکول کا خرچ ادا کیا اُنکے دادا نے۔ یہ تو تھا اپنے گھوڑے کا سوار۔ سوار ہی نہیں بلکہ شہسوار۔ وادیوں میں دُور دُور تک نکل جاتا، اپنی مستیوں میں۔

اچانک کچھ ایسا موسم بدل گیا کہ ہر طرف سے آندھیاں اُٹھیں، جھکڑ آئے، طوفان آئے۔ تب اُس شہسوار نے اپنی منکوحہ کو پہلی بار، دن کی روشنیوں میں، اپنی آغوش میں اُٹھا لیا۔ اپنے بچوں کو اُٹھا لیا، اور اُنکو بگھی میں لاد دیا۔ اور اپنی بگھی اور گھوڑوں کو لیکر جدھر راستہ نظر آیا، اُدھر نکل پڑا، اس سے پہلے کہ وہ ساری وادی اُن طوفانوں کے زد میں آ کر صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔

کہتے ہیں بڑے ہی گھنگھور سیاسی بادل اُٹھے تھے ہر طرف اور جب برسنے کو

آئے تو ایسے برسے کہ ہر طرف لاچارگیوں کا، بے چارگیوں کا سیلاب آ گیا۔ جو چیز راستے میں آئی۔ اُس کی زد میں آ گئی ۔۔۔ تو وہ اپنی وحشتوں کے ساتھ جنگلوں کا ہو گیا۔ گھوڑے سرپٹ دوڑتے چلے گئے۔

وادیاں گئیں! جھیلیں گئیں، ندیاں گئیں، نیلی پہاڑیاں دُور ہوتی چلی گئیں وہ بھاگے جا رہا تھا۔ طوفانوں سے زیادہ تیز رفتار تھی اُس کی۔ اچانک ایک بہت بڑی چٹان سے ٹکرا گئی بگھی۔ گھوڑے لہولہان ہو کر راستے کے دونوں رُخ پر گر پڑے، اُن کے شہسوار کے سر پر، شانوں پر اور پتہ نہیں کہاں کہاں بڑے گہرے زخم آئے۔ خون ہی خون بہنے لگا۔ بگھی کا ایک پہیہ پتہ نہیں کس کھڈ میں جا گرا۔ لیکن بچوں کی ماں نے اپنے جگر گوشوں کو اس طرح اپنے جگر میں دھنسا لیا تھا کہ اُن کو تو زیادہ کچھ ہوا نہیں، لیکن اُس کے اپنے سینے پر، شانوں پر، چہرے پر، پیروں پر گھاؤ لگ گئے تھے۔

کیسے اور کدھر جائیں، کدھر بڑھیں؟ وادیوں کی، جھیلوں کی مرغابیاں، باز، شکرے اور سارے آبی پرندے اپنی وحشتوں میں چیختے، چلاتے، طوفانی شور مچاتے ہوئے بے سمت اڑنے لگے۔ کہیں اماں نہ ملی تو آسمانوں کی بلندیوں کی طرف اُڑتے رہے اپنی اپنی اڑان کی سکت سے آگے اور بے رحم فضاؤں میں دم توڑ کر نیچے گرتے رہے۔ ٹھنڈی بے حس زمین پر۔ جو خود بھی طوفانوں کا ظلم سہہ گئی تھی۔

شہسوار نے آسمانوں کی طرف دیکھا اور پھر نیچے۔ اُسے دُور انسانوں کا ایک غول نظر آیا۔ وحشیوں کی طرح دوڑتا ہوا۔ ڈیڑھ دو دن بعد وہ سارا غول ایک ایسی جگہ پہونچا جہاں سے شہر کے دھندلے دھندلے ہیولے نظر آئے۔ سب بکھر گئے۔ تتر بتر ہو گئے۔ کسی کو کوئی سمت سوجھتی نہ تھی۔ شہر کی فصیل کو لگی ایک سرائے تھی۔ وہاں ایک کنواں تھا۔ وہاں کچھ ٹھہر گئے۔ کچھ دم لیا تو زخموں کا احساس بڑھ گیا۔ رات

کے اندھیرے اور دن کی روشنیاں بھی مرہم بنیں اُن کا۔ فصیل کے اندر کچھ یہاں کچھ وہاں، زندگی کے کچھ ایسے، کچھ ویسے وسیلے مل گئے۔ شہسوار کو اپنے ایک بھولے ہوئے بھائی کا پتہ چل گیا شہر میں۔ وہاں آسرا ملا، سہارا ملا اور دوا دارو بھی ہوئی لیکن اُس شہسوار کے، بگھی کے آہن سے لگے زخم ہرے کے ہرے ہی رہے۔ شاید اُس نازنین کی زندگی میں پہلی بار ایک ایسی گھڑی آئی جب کہ اُس کے شہسوار نے اُس کو اور اُس کے جگر گوشوں کو ایسی نظروں سے دیکھا، جن میں ایک عجیب روشنی تھی، قربتوں کی، تمناؤں کی، اور اُن تمناؤں کی لازوال ہمیشگی کی۔ اُسی لمحے ایک چیخ جیسی ایک تڑپ کے ساتھ وہ روشنی اچانک بجھ گئی۔ اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں، جن میں وہ تین چہرے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے۔

دل میں بسی ہوئی تاریکیاں ساری فضا پر چھا گئیں۔

اُس شہسوار کے بھولے بسرے بھائی کے چھپر نما آسروں سے نکل کر وہ شہر کی ایک تاریک گلی میں اٹھ آئی تھی۔ اب تو وہ دن اُس کو بڑے ہی محترم لگتے کہ وہ اپنی خاموشیوں کے لہجوں میں اُس کو ایک اعتماد بخش دیتے کہ ہاں یہ سب اندھیرے تمہارا احترام کرتے ہیں۔ پھر بھی شہر کی کچھ کھلی کھلی گلیوں کی ہوائیں ذرا تیز ہو جاتیں اور اِدھر آ جاتیں تو وہ سہم کر اپنے سر پر اوڑھی ہوئی ردائے خیر کو سنبھالنے لگتی۔ بچے تو اب مدرسوں میں پڑھتے تھے۔ اُن کے تن کو ہر طرح ڈھانکے رکھنے کے لئے وہ اپنے لبادے پر پیوند لگا لیا کرتی۔ جسم کی لاج بچائے رکھنا تو سب سے زیادہ بے وفا ہوتی ہے۔ چھوڑ جانے والے سے بھی، ساری دنیا سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔ بگھی کے حادثے میں لگے اُس کے ایسے کونسے زخم تھے جو مندمل ہو سکتے تھے۔ جسم پر لگے زخموں کے بھرنے کا خیال آتا تو سوچتی کہیں روح کے زخم تازہ نہ ہو جائیں۔ دُکھ کے دن تو کبھی بیتے ہی نہیں، لیکن یہ تو شہر ہے۔ یہاں کی زبان کے لفظ بھی تو شہری ہوتے

ہیں۔ یہ تو کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان الفاظ میں کہ دُکھ کے دن ہوں یا دکھ کی راتیں سب دو گھڑی میں بیت جاتی ہیں۔

وادی کی طرف جانے کا تو اب خیال بھی نہیں کر سکتی تھی وہ۔ وہاں تو شاید اب وہ نیلی نیلی پہاڑیاں بھی بچ نہیں پائی ہوں گی۔ سُنا تھا اب تو اُن جھیلوں میں پانی بھی نہیں رہا تھا۔ مرغابیوں کے سڑتے جسم تھے اور بن آواز پھڑپھڑانے والے اُن کے زخمی پر ـــ اور گاؤں بھی اب ہڈیوں کے ڈھانچے لگتے تھے نہ اُن میں کوئی جان۔ نہ سانس باقی۔ کتنی ہی راتیں اس نے ایسے خواب دیکھے تھے وہ سہم جاتی تھی کہ دونوں بچے لگے لگے سوتے تھے اُس سے۔

لیکن انہی راتوں کی صبحوں کے ساتھ وہ بچے بھی تیزی سے جوان ہو گئے۔ سورج کو کھلونا بنا کر کھیلنے لگ گئے تھے ـــ بیٹی کی بڑھتی عمر کو دیکھ کر تو وہ خود شرم و حیا سے سرخ ہو جاتی کہ وہ بھی تو کبھی ایسی ہی تھی۔ تھوڑی ہوشیار، تھوڑی خفتہ خفتہ ـــ تھوڑی گل و گلزار، تھوڑی پُر خار۔ تھوڑی سی خزاں، تھوڑی بہار، تھوڑی نڈر، تھوڑی ڈرپوک اور قد نکل آیا تھا۔ ایسا کہ چھت سے لٹکتی لالٹین کی بتی وہ بڑی آسانی سے کھڑی کھڑی ہی کم کر دیتی تھی۔ وہیں تو گاؤں کے اُس جھیل والے گھر میں اُس لم تڑنگ، دبلے پتلے، کالج والے کو دیکھا تھا اُس نے۔ جو مدھم مدھم سا نظر آیا تھا اُس رات جب اُس نے اُس کو غور سے دیکھا تھا۔

اِن خیالوں کے بہاؤ میں اُس نے سوچا تھا، پتہ نہیں وقت کے کس قبرستان میں دفن ہوں، اُن یادوں اور اُن تصوّرات کے ساتھ ـــ وہ جلتی سانسوں کی اگربتی بھی بجھ گئی تھی، جو کبھی وہاں دھواں دیتی تھی۔

لیکن آج تو وہ تیزی سے نکل آئی۔ اُن خیالوں سے جب اپنے جوان بیٹے کو دیکھی کہ اُس کی آنکھوں میں، اُس کے انگ انگ، اُس کی آواز میں تو وہی پتھر بولنے لگا

تھا، اُس کا شہسوار، اُس آواز سے وہ دیوانہ وار لپٹ جاتی اور اپنے جوان بیٹے پر وار سے نیار سے ہو جاتی۔ کیا قدرت ہے کہ وہ ننھا شہسوار اور بیٹا بھی وہی شہسوار۔ شاید گرتے دلوں کی تعمیر ایسے ہی یقینوں سے ہوتی ہے، ایسے ہی ایمانوں سے ہوتی ہے۔ کہنے والوں نے تو ایسے ہی سچے دلوں کو کعبہ کہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کعبہ کا سیاہ لباس انسانی دلوں کے دُکھوں سے، رنج و محن سے، غم و اندوہ سے، اسی ماتمی رنگ میں ہمکلام ہوتا ہے اور اُس کے قرب کا سکون پانے والوں سے کہتا ہے کہ میرے اس بلند ترین اور مقدس ترین مقام پر بھی، غمِ جہاں کی سچی تصویر تو میں ہی ہوں کہ یہ عالم ہست و بود انسان کے ایمان و یقین ہی کی ایک کسوٹی ہے، ورنہ اس کی تخلیق کیوں ہوتی۔؟

اس دنیا کے بازار میں تو سارے ہی دکھیوں کے سوداگر ہوتے ہیں۔ قریب کے بھی اور دُور کے بھی۔ زندگی کے جن تپتے، سلگتے صحراؤں سے وہ گذری تھی اور جس جاں کاہی سے گذری تھی، چلچلاتی دھوپ میں، جہاں نہ کوئی پیڑ کا سایہ نہ پانی کی آس۔ اُس کا احساس بھلا کسی دوسرے انسان کو کیسے ہو سکتا تھا؟ کبھی ہو بھی سکتا تو شاید اُس کو ہو سکتا جو کبھی دوزخوں میں انگاروں سے بنے راستوں پر ننگے پاؤں چلتا ہوا گذرا ہو۔ جن کی کوئی جلد بھی نہیں ہوتی۔

آج وہ ہوتا بھی تو کیا کرتا، اُس پُر شباب بیٹی کا باپ، کب کسی کی آرزوئی ارمانوں کا پاس رہا تھا اُس کو جو بیٹی کی کچھ نازک تمناؤں اور نوخیز دلربائی کا کرپاتا۔ اُس کے مزاج میں تو پھولوں کا کوئی رنگ تھا نہ رس۔ ایک بے حس تنے والا پیڑ۔ وہ تو اُس حیلو شرم و شرافت میں لپٹے لپٹائے شباب کو بھی بے زبان سمجھ کر باندھ دیتا کسی کھونٹے سے اور یہ بھی نہیں دیکھتا کہ جس ڈوری سے اُس کو باندھا ہے۔ وہ ریشم کی ہے یا سن کی۔ ایسا ہی تو تھا وہ ــــ

لیکن اس ماں کے پاس بھی اپنی بیٹی کے لئے اُس کی اپنی کونسی آرزو و تمنا تھی جس میں کچھ دم خم ہوتا ۔ بیٹی کے لئے شہزادوں کا خواب دیکھتے دیکھتے تو وہ اپنے جھونپڑے کی خاک تک آگئی تھی ۔ بس جس سے شرافت و ناموس کی آس ہو گئی وہی سب سے اچھا ۔ وہی سچا ۔ بیٹی کی شادی ہوگئی ۔

ایک کچھ قریب ہی کے دیش والے سے ۔ جو بس گیا تھا اس شہر میں ۔ وہ کچھ نہیں تو اپنا ایک چھوٹا موٹا بزنس تو رکھتا تھا ۔ اور اب ہوا بھی تھا ایسا کہ اس شہر میں بسنے بسنے، شہر کی اس تاریک گلی ہی میں آکر بس گیا وہ بھی اپنی دلہن کے ساتھ ـــــ اُس کو ایک آرام ہو گیا کہ بیٹا تو کلیجے کو لگا ہی ہے، بیٹی بھی نظر دل کے سامنے ہی ہے ۔ اور پھر وہ بیٹی کے گھر والا بھی ساتھ ۔ تھوڑی ہمت آگئی ۔ جیسے اب گھر بس گیا ۔

بیٹی کے جب تیسرا بیٹا بھی ہو گیا تو وہ بار بار نانی بن جانے کے خیال سے ہنستی رہتی ہنستی ہی رہتی ۔ اپنے آپ میں ـــــ لیکن .....

بگڑی ہی قسمتوں کے ویرانوں، کھنڈروں میں کتنے حشرات الارض گھر بنا لیتے ہیں اپنا اور ان میں بسے بسک سے کتنے را دکشر دم ہوتے ہیں اور گھات میں پڑے رہتے ہیں بد بختوں کے ـــــ ایسا ہی ایک گھر بن گیا تھا ۔ اُس بیٹی کے دل میں ۔ بگھی کے حادثے میں تو وہ ماں کے کلیجے میں محفوظ تھی لیکن کہیں اندر جو ایک ضرب لگی تھی، وہ دھیرے دھیرے دل میں ایک گھر کر گئی اور وہاں ایک سوراخ بن گیا ۔

ساری زمین کی گہرائیوں اور سارے آسمانوں کی وسعتوں میں، ہر سمت، ہر رُخ، سارے موسموں کی شفقتوں اور نگہبانیوں کے ساتھ، دل کی اُمیدوں اور رات کی بے خوابیوں کے ساتھ اپنے نحیف وجود کو اپنے دل کی سچائیوں اور نفاستوں کے ساتھ لیے گھومتی

رہی، اُس تلاش میں کہ کہیں ایسی مٹی مل جائے ایسا پتھر مل جائے، ایسے پھول پات مل جائیں، ایسی کوئی جڑی بوٹی مل جائے جو اُس کی بیٹی کے اُس زخم کو بھر دے جو اُس کے دل کے پاس تھا۔ وہ پھرتی رہی ہر طرف، ہر سمت اور زمین گھومتی رہی اپنے محور پر۔ لیکن اس زمین کی نامعلوم گہرائیوں میں، صدیوں سے چھپا ہوا ایک آتش فشاں پہاڑ تھا شاید وہ پہلی بار اس طرح پھٹ پڑا کہ ساری زمین پھٹ پڑی۔ بیٹی کا دل آخر پھٹ پڑا۔ ساری فضا، اور ساری کائنات کی وسعتوں سے آگے بھی، اگر کوئی خلا ہوتا تو وہ دھواں وہاں تک بھی پھیل جاتا، وہ دھواں جو اس کی بجھتی آنکھوں سے نکلا تھا۔ وہ تاریکیوں کا دوزخ جس کی بنیاد اُس کی نظر میں کبھی اُتر جانے والا وہ ایک سیاہ دھبہ تھا۔ وہی دھبہ اب اُس کے سارے وجود کا دوزخ بن گیا تھا۔

لیکن اُن دُور تک لامحدود فضاؤں میں پھیلی ہوئی تاریکیوں کے بیچ وہ ایک روشن مینار تھا، اُس کا جوان، تنومند، باکمال بیٹا۔ ماں کے دل اور اُس کی آنکھوں سے بچ بچ کر، اُس نے اُس نحیف اور پاکیزہ وجود پر جمی ہوئی اُن تاریکیوں کی سیاہیوں جیسی گرد کو، دھیرے دھیرے اپنی پلکوں سے صاف کیا اور اپنی پلکوں میں وہ نور بھر لیا جو شاید صرف ماں کی عظمتوں کو نکھار نکھار کر سب سے اونچے آسمان پر سب سے زیادہ روشن ستارہ بنا دیتا ہے۔ اُس ستارے کی دُور سے نظر آنے والی کم کم چمک جیسی مسکراہٹوں سے اُس نے ماں کے دل کی تاریکیوں میں چھوٹے چھوٹے چراغ دِلا دیئے۔ تب دھیرے دھیرے ماں کی آنکھوں کی تاریکی میں بھی کسی روشنی کی ہلکی ہلکی کرنیں، اب تب چمکنے لگیں۔

اب جب کہ دراصل اُس ماں کی ساری روح ہی ایک زخم بن چکی تھی، تو وہ زخم جو کبھی کبھی کے حادثے میں اُس کے سارے جسم پر لگے تھے، وہ کیا کر لیتے اس کا۔ وہ عمر کے ساتھ بڑھتے رہے تھے اور ہرے ہوتے ہو گئے تھے اور ہرے ہوتے ہوتے سیاہ ہو گئے

تھے۔ پیر کا زخم تو کالا زہر زہر بن گیا۔

"پیر کاٹ دینا پڑے گا ۔۔۔" ڈاکٹر نے کہا

اُس خاتون نے سنا لیکن اپنی قوت صبر و ضبط، ایثار و تحمل، بردباری و برداشت، وضع خوداری اور انسانی کردار کی ایسی ہی کتنی صفات عظیم کی مشفق آغوش میں پالے ہوئے، اپنی روح کے اُس زخم پر وہ کتنی نازاں تھی کہ ایک شانِ استغناء کے ساتھ اُس نے کہا۔

"میرے پیر کیوں کاٹتے ہو، بہتر تو یہ کہ میرے پیروں کو سلامت رہنے دو اور اُن سے میرا جسم الگ کر دو۔"

لیکن ہوا ایسا کہ اُس کے پاؤں اُس کے ساتھ سلامت رہے ۔۔۔ کہیں نہ کہیں سے، کسی نہ کسی قسم کا مرہم فراہم کرتا رہا۔ اپنی زندگی کا مقصد بنا کر، شب و روز اُس کے پیروں کو آنکھوں سے لگائے، رکھنے والا اُس کا وہ جوان مرد بیٹا۔

اُس ماں کے پیر کا زخم مندمل ہونے لگا۔ اپنے مندمل ہونے والے زخم کو دیکھ کر اُس ماں کی آنکھوں سے، اُس کے دل سے ہزار آنسو بہنے لگے۔ ہر رات اِسی خیال سے وہ جھرنے پھوٹنے لگے کہ اِن سوکھے ساکھے لکڑی کے بے جان ٹکڑوں جیسے پیروں کے زخم کی دوا تو مل گئی اِس جہانِ فرتوت میں لیکن ایک جوان، پُر بہار آرزوں، تمناؤں اور ارمانوں کی حرارتوں میں دھڑکنے والے دل کے زخم کیلئے کوئی شفاء نہیں۔

ہزاروں آفتابوں اور ماہتابوں کی اِس زمین کی قائم و دائم کیمیا، گری میں، جس سے وہ زمین خود اپنے کروڑوں میں گھرے زخموں کے باوجود زندہ رہتی ہے، کس قدر حقیر، کس قدر ہیچ ہے انسان اِس نظام کائینات میں، جس کی زندگی کے لئے کہتے ہیں یہ سارا نظام تخلیق ہوا تھا۔ اگر یہ سچ ہے، ایک حقیقت ہے کہ انسان کا ایک ایسا زخم بھی یہاں مندمل نہیں ہو سکتا تو اِس نظام کی ساری بلندیاں، یہ ساری گہرائیاں،

یہ لامتناہی وسعتیں اور اُس کی عظمتیں کِس کے لئے ہیں۔ انسان کے لئے یا غیر انسان کے لئے؟

لیکن اب یہ ساری باتیں تو پچھلے کتنے ہی یگوں کی کتھائیں بن گئی ہیں، اب انہیں کون سُنائے گا۔ کون کہے گا کون لکھے گا، کون پڑھے گا۔ یہ سارے 'یگ'، یہ سارے زمانے تو آخر ایک آنسو ہی بنتے ہیں۔ اب وہ آنسو کسی دامن پر گرے۔ مٹی پر گرے یا پتھر پر، وہ تو نابود ہو ہی جاتا ہے اور سمے بیت جاتا ہے

اُس کی آنکھوں سے پھوٹنے والے جھرنے تو رات بھر بہتے رہتے، ذہن میں اُٹھنے والے ایسے سوالوں کی پیدا کی ہوئی جلن کے ساتھ لیکن صبح کی ٹھنڈکوں میں پھیلتے اُجالوں سے باخبر ہو کر وہ سہم جاتے، کہیں رُک جاتے۔ رات کی جلن اور صبح کی ٹھنڈک پپوٹوں کا ورم بن جاتی ـــ لیکن صبح کے اُجالوں جیسے تر و تازہ تین چہرے اُس کو تکنے لگ جاتے اور اپنی اُن آنکھوں سے کہتے اُس سے ـــ

"تم ہم کو دیکھو نا ـــ صرف ہم کو دیکھتی رہو نا، ہماری طرح تمہاری آنکھیں بھی چمکنے لگیں گی ـــ دیکھو ہماری آنکھوں میں ـــ دیکھو نا ـــ"

وہ ایک عجیب تڑپ کے ساتھ اُن کی آنکھوں میں دیکھتی۔ وہاں تو سب کچھ چھکا چھک ـ نئی روشنی کا سیلِ رواں ـــ اُف زندگی تیرے روپ سروپ، تیری آہ کا دوسرا روپ واہ ـــ میں آہ بنی تو میرا شہسوار، واہ یہ آہ بھی زندگی، واہ بھی زندگی ـــ یہ آہ سچ نہ واہ جھوٹ۔

اب اُس کی بیٹی کے تینوں بیٹے اُس کی زندگی کی سانس بن گئے۔ جینے کی آس بن گئے۔ اُس کے نحیف و لاغر جسم میں دوڑنے والا خون بن گئے۔ اُس خون سے بننے والی جینے کی طاقت بن گئے ـــ اُنھوں نے اُس سے کہا۔

"تم اب چل نہیں سکتیں۔ ہم تمہارے پاؤں ہیں، سہارا ہیں۔" پھر

کہتے۔" تمہارے بال کتنے سفید ہو گئے ہیں۔ بہت بھلے لگتے ہیں۔" پھر کہتے۔" تمہارے دانت تو ہیں ہی نہیں ۔ یہ پوپلا منہ!" تینوں زور زور سے ہنسنے لگتے، وہ اپنے پوپلے منہ سے ایسے کھِلکھلا اُٹھتی جیسے اُن سے زیادہ وہ ہنس رہی ہے۔"

پھر جیسے وہ کہتے۔" تمہارے چہرے پر کتنی جھریاں ہیں۔ جیسے لے حساب جھرنے ہیں پیار کے۔ ایک دو، تین، دس۔ اور سب میں بہتا ہوا موتی جیسا صاف، شفاف اور میٹھا پانی پیار کا ــ ہماری ماں کے چہرے پر ایسی پیار سے بھری جھریاں نہیں تھیں اِس لئے وہ ہم سے پیار نہیں کرتی تھی، بہت غصہ کرتی تھی۔ دھونس جماتی تھی اور پٹائی بھی کرتی تھی۔ اُس کے چہرے پر جھریاں نہیں تھیں نا ـــ"

ایسی باتیں کرنے والے دونوں اسکول کی اُن بڑی کلاسوں میں چلے گئے۔ جہاں بات کرنے سے پہلے کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ لیکن سب سے چھوٹا تو وہی بات کرتا رہا اپنی چھوٹی کلاس میں سیکھی ہوئی باتیں ــ

وہ سوچتی" یہ چھوٹا بہت بڑا بھی ہو جائے تو چھوٹا ہی رہے گا۔ بہت چھوٹا۔ کیا ضروری ہے کہ ہر چھوٹا، بڑا ہو جائے ــ قدرت نے اپنے کونسے قانون کو سچا ثابت کیا ہے؟ وہ چھوٹا آج جو کچھ کہتا ہے۔ وہی سچ۔ سب سے بڑا سچ ـ اور جو کچھ نہیں کہتا، وہ بھی سچ۔ بس سچ ہی سچ ـــ" پھر سوچتی۔" لیکن اس معصوم چہرے پر یہ سچ اور جھوٹ کے رنگ کیوں؟ یہ بے رنگی کیوں؟ اس سچ اور جھوٹ کی بے غیرت دنیا میں جہاں نہ سچ عزت، نہ جھوٹ غیرت ــ اب اس دنیا سے میرا کوئی واسطہ ہے تو وہ ہے اُس چہرے کی معصومیت۔ اس سے بڑا ظلم اس دنیا کا اور کیا ہو گا کہ اس معصومیت کو بے وجہ، بے سبب مجروح کر دے، اِس سچ اور جھوٹ کے بیداد سے۔!"

وہ بھول چکی تھی کہ اِن تین چہروں کی معصومیت اور اُس سب سے چھوٹے سوداگر کی لین دین سے آگے دنیا کی کوئی گہما گہمی بھی ہے۔ کوئی دُنیا بھی ہے یا کوئی

کائنات بھی ہے۔

اُس کو اپنے اِن یقینوں اور اُنکی حرارتوں میں چلنے والی سانسوں میں جو قرار و سکون میسر تھا اُس کو اب زندگی کی پہلی اور آخری حقیقت جان کر، کسی بھی موت کے خیال کو وہ بے معنیٰ ہی سمجھتی ۔ جیسے اُس کی زندگی کی طرح اُس کی موت بھی بے معنیٰ ہی رہے گی ۔

اُس دن اسکول بند تھا، تینوں کی چھُٹی تھی اور وہ اُن تین ننھّے فرشتوں کی ہنسی جیسی صبح کی روشنی میں نہال، خود بھی ہنس رہی تھی۔ لگتا تھا اُس کے لیئے ساری صبح فرشتوں کی بستی ہے اور وہ ننھا سوداگر اُس کی دھڑکنوں میں ایک نئے سورج کی طرح طلوع ہو رہا تھا ۔ اور اُس کے اندر ایک نور پھیل رہا تھا۔ کیا ہو گیا تھا اُس کے اُس بوڑھے جسم کو، اندر اندر روشن لگتا تھا ایک احساس کی لذتوں کے ساتھ ۔ ایسے میں بچوں کا باپ آگیا۔ کچھ دیر اُن سب کا تماشہ دیکھتا رہا ۔ پھر کسی خیال سے تینوں بچوں کو، کھلی ہوا میں کھیلنے کے لیئے باہر بھیجدیا اور اُس کے سامنے ادب سے بیٹھ گیا ۔ بولا ۔

"ماں ۔ تم سے کہنا ہے کہ میرے دیش سے میری ایک بوڑھی بہن کا خط آیا ہے کہ وہ بہت بیمار ہے اور اُس کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ وہاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی اُس کی بہت ساری جائیداد ہے اور کچھ پرانے کاروبار ہیں اور اُن کا دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے ۔ اُس کی کوئی اولاد نہیں ہے ۔ مجھے لکھا ہے کہ یہاں آجاؤ، اب صرف تم ہی اس جائیداد اور کاروبار کے وارث ہو ۔ تم نے اس شہر میں پریشان زندگی گذاری ہے۔ اُس سے تم کو چھٹکارا مل جائے گا اور تمہارے ساتھ تمہارے بچوں کا مستقبل بھی سنور جائے گا۔ اُن کو خوب پڑھاؤ لکھاؤ، اُن کو خوبصورت زندگی دو ۔ جلد آجاؤ ۔"

میں نے بہت غور کیا۔ بہت غور کیا تو لگا میرا کیا ہے اب۔ میرے
لئے میرے بچوں کا مستقبل ہی سب کچھ ہے۔ اب یہاں اس تاریک گلی میں آن کے
لئے کیا رکھا ہے۔ سوچا ہے کہ میں بچوں کو لے کر اپنے دیش چلا جاؤں۔ میں نے آپ
کے بیٹے سے بھی بات کر لی۔ سب کچھ سن کر اُس نے کہا "ضرور جاؤ۔ یہاں کیا
رکھا ہے بچوں کے لئے۔ میری یا میری ماں کی کوئی فکر نہ کرو۔ میری ماں کے لئے میں
سب کچھ ہوں ــــ جاؤ۔"

بوڑھی ماں کے سارے ڈھانچے کے اندر جو ابھی ابھی ایک روشنی تھی وہ
غائب ہو گئی ــــ پل بھر میں اُس کے اندر اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا، جو اُس کی
آنکھوں میں بھی اُتر آیا۔ اُس کو تو لگا یہ اندھیرا اس قدر قدیم اور بوسیدہ ہے کہ یہ
تو بار بار میرے وجود کا حصہ بنتا رہا ہے ــــ شاید یہ سارے واقعات میری
موت کے بعد بھی کبھی رونما ہو رہے ہیں ــــ شاید موت کے بعد بھی انسان کے کچھ
حواس، کچھ چھپی چھپی خواہشیں، آرزوئیں اور کچھ خوف اُس کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔
وہ اندھیرے تو اس کی آنکھوں میں اندھیرے ہی بنے رہے۔ لیکن ایک ہلکی سی صبح
کو جب اُس نے اپنی بیمار اور نحیف آنکھیں کھولیں تو اُسے بار بار یہی خیال آتا رہا کہ وہ
سب تو چلے گئے، وہ سارے ننھے سوداگر۔

یہ تو اُس کا کوئی خواب تھا یا کوئی جیتا جاگتا تصور، اُس نے ضرور محسوس کیا
تھا کہ اُس کی دو گھوڑوں والی بگھی کا ایک اور حادثہ ہو گیا ہے۔ دونوں گھوڑے ایک
چٹان سے ٹکرا کر اِدھر اُدھر ڈھیر ہو گئے ہیں۔ لہو لہان ہو گئے ہیں۔ بگھی کے پہیے بھی
چکنا چور ہو گئے ہیں ــــ وہ تو اکیلی تھی بگھی میں۔ کتنی چوٹیں آئی ہوں گی؟
لیکن سارے جسم پر ایک بھی چوٹ نہیں تھی۔ یا پھر کسی چوٹ کا احساس نہیں تھا
اس ٹوٹی ہوئی بگھی سے اُس کو دو مضبوط ہاتھوں نے اُٹھا لیا اور اپنے جوان اور گرم سینے

سے لگا لیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کی ہی نہیں ساری دنیا کی زندگی یہاں اِن دو ہاتھوں میں اور اِس گرم سینے میں محفوظ ہے۔ اُس کی پیار بھری دھڑکنوں میں محفوظ ہے وہ دو مضبوط ہاتھ اور وہ مضبوط گرم سینہ اُس کے جوان اور باکمال بیٹے کا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں وہ اپنی ماں کو سینے سے لگائے کئی میل چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ اور اُس کو اپنے گھر لاکر وہاں لٹا دیا جہاں اُس کی روح کو، اُس کے دل کو، اُس کے جسم کو صرف آرام ہی آرام مل سکتا تھا۔

عمروں بعد میں اُس شہر آیا تھا۔ جانے اُس شہر میں میرا کیا تھا یا میرا کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے اُس شہر میں ایک راستہ مل گیا۔ اُس راستے سے مجھے جانا تھا۔ میں اُس راستے پر چل پڑا تھا۔ اُس راستے پر نہ میرا ذہن میرے ساتھ تھا نہ میرا دل ـــ ایک احساس تھا۔ ایک یقین کی طرح کہ اگر میں زندہ ہوں تو وہ بھی ضرور زندہ ہے۔ اُس راستے نے مجھے ایک ایسے مقام تک پہونچا دیا جہاں مجھ سے دو قدم آگے ایک دروازہ تھا، جو میرے لئے کھلا ہوا تھا۔ مجھے ایک یقین سا ہو گیا کہ میں اندر ہوں اُس گھر کے۔ جہاں میری آنکھوں نے دیکھا، یہ شام ہے اور کچھ آگے میری آنکھوں کے سامنے ایک لالٹین لٹکی ہوئی ہے اور اُس لالٹین کی روشنی میں مجھے نظر آنے والی ایک کھڑکی ہے ـــ وہی اُس جھیل والے گھر کی کھڑکی۔

اور پھر اُس ہلکے گرم موسم کی ہلکی گرم رات میں جھیل سے آنے والی ذرا سی ٹھنڈک لی ہوئی ہوائیں ـــ سب سو جاتے ہیں اپنے خوابوں میں کھو جاتے ہیں، تو وہ چپکے سے اُٹھتی ہے اور اُن کو دیکھتی ہے ـــ کتنے بڑے ہو گئے ہیں وہ سب کالج کے عمر کے بھرے پرے۔ لیکن وہ دبلا پتلا، وہ بھی تو لمبا تڑنگا لگتا ہے ـــ وہ اُس پر غور کرتی ہے اور سوچتی ہے ـــ یہ تو اِس لالٹین کی روشنی میں بھی مدھم مدھم سا نظر آتا ہے

سویا ہوا ہے نا ___ کھلی کھڑکی سے باہر جھیل کی طرف دیکھتی ہے اور اپنے بستر کی طرف لوٹ آتی ہے ___ ایک سوال وہ اپنے آپ سے پوچھتی ہے کہ ان سب میں اُس کا کون ہے؟ اُس کا اپنا کون ہے؟"

آج اُس برسہا برس سے جلتی ہوئی لالٹین کی روشنی میں وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ نحیف و زار ___ شاید اُس نے نہ میرے قدموں کی چاپ سنی، نہ میری آواز کو پہچانا ___ لیکن اُس لالٹین کی روشنی جیسے اچانک ہر طرف پھیل گئی اور اُس روشنی میں اپنی بجھتی آنکھوں سے صاف دیکھ لیا، پہچان لیا مجھے ___ وہ اپنی عمر کی ساری توانائیوں کو سمیٹ کر اُٹھ بیٹھی۔ اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید صدیوں بعد، پہلی بار اپنے پیروں کے سہارے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور کھڑی ہوئی تھی میرے سامنے۔ اُس نے شاید میلوں دور سے مجھے دیکھا، پھر کچھ فاصلے سے دیکھا اور پھر اُس نے بہت قریب سے دیکھا۔ وہ مجھے دیکھتی رہی۔ میں اُسکو دیکھتا رہا۔ بالکل چپ چاپ ___ بالکل خاموش۔ شاید ہماری خاموشیوں نے ہمارے درمیان کے فاصلوں کو کچھ گھٹا دیا۔

اُس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ اس طرح جیسے ابھی نہیں، وہ میلوں کی مسافت طے کر کے یہاں پہونچی ہے ___ کچھ دیر اُس نے سر نہیں اُٹھایا۔ جیسے اُس کو اُس کی جسمانی تھکن کا کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ تو جیسے چاہتی تھی کہ تھکن سے چور اُس کے ذہن کو کہیں دو گھڑی سکون مل جائے۔ کوئی ایسا مقام مل جائے ___ میں نے اُس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ پھر آہستہ سے اُس کے شانے پر بھی کہ شاید اُس کو وہ احساس ہو جائے، وہ یقین ہو جائے،

جس سے اُس کے ذہن کی تھکن بھی دور ہو جائے۔ تب اُس نے اپنا سر اُٹھا کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے اُس کی آنکھوں میں پھیلے ہوئے تپتے صحراؤں میں اُس کے لئے میں ایک سراب ہوں۔

رولاں

یہ ایک سرسبز و شاداب وادی میں بنی ہوئی ایک قدیم طرز کی بہت ہی مضبوط اور وجیہہ عمارت ہے جس کا نام ہے "کسان وِلا"
اس نام کو سُن کر اکثر اس مکان کے تنومند و معمّر اور اپنی نکیلی سنہری مونچھوں پر دنیا کو نچانے والے مالک و معمار کے چہرے کی وہ مسکراہٹ یاد آتی تھی جو ایک فخر و یقین کا اظہار کرتی ہوتی کہ یہ مکان کسان کی محنت اور میری دولت کی دین ہے، دنیا چاہے جو بھی سمجھے۔
وہ سنہری مونچھوں والا معمر شخص جو بیک وقت ظالم و حاتم نظر آتا تھا، اس سارے دیہی علاقے کا ایک مسلّمہ انداز میں حاکم بن چکا تھا۔ اُس نے ساری زندگی اس وادی کی تعمیر و آرائش میں گذار دی تھی۔
وہ اپنی بارہ سال کی عمر میں بے کس و نادار تھا اور شاید تُرک یا ایران سے آنے والے قافلوں کے ساتھ اس وادی تک پہنچ گیا تھا آٹھ آنے روز کی مزدوری پر کھیتوں میں کام کرنا سیکھا تھا۔ جو پھیل پھیلا کر آج میلوں تک اس کی ملکیت بن گئے تھے، ان ہی ہرے بھرے کھیتوں اور پُر شباب مرغزاروں کے بیچ بنا تھا۔ "کسان وِلا" وہاں ایک سنہری فصلوں جیسی، سنہری سنہری بستی بھی بس گئی تھی۔ اُس بستی کی بنیاد بھی اسی کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اس نے اس بستی کو دھیرے دھیرے ایک مضبوط

۵۲

اُس نے پھر اُوپر فضاء میں کہیں دیکھا اور ایک نحیف آواز میں کہا "انسان کو زندگی تو صرف ایکبار ملتی ہے۔"

اور پھر وہ اپنے بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

▲

قلعہ بنا دیا تھا اور بستی والوں کی نظروں کے سامنے بڑھتے بڑھتے وہ خود اس کی فیصل بن گیا تھا۔

اس کا نام تھا ترزی شا۔

ترزی شا ۸۵ سالوں تک پورے مردانہ انداز میں سانس لیتا رہا تھا' زندگی کو اپنی صحت مند سانسوں میں پورے پورے اعتماد اور شوق و ذوق کے ساتھ جکڑا ہوا تھا۔

اچانک ایک بار جو اس کا دم ٹوٹا' تو سوائے اس کے شاید کسی اور کو یقین نہیں ہوا کہ سانس باقی نہیں ہے۔ آخری سانس نے دراصل ایک مسکراہٹ بن کر اس کے ہونٹوں پر بسیرا کر لیا تھا۔ اُس مسکراہٹ میں ایک ہی اعلان تھا۔

"میں خود ساز آدمی ہوں ـــــ میں خود ساز آدمی ہوں۔"

اس کا دم ٹوٹنے سے بہت پہلے ہی اس کی آل اولاد اپنے دلیش کے بڑے نگروں یا بدیشی شہروں میں جا کر بس گئی تھی۔ باپ کے پسینے کی بے حساب کمائی نے "کسان ولا" کو ان کی نظروں سے گرا دیا تھا۔ بھائی بند بھی اس کا دم ٹوٹنے کے بعد ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے تھے۔ ولا کے قدیم باڑے میں بنے اصطبل میں بندھے ہوئے گھوڑے اور ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ٹریکٹرس بکنے لگ گئے تھے اور ان کی قیمت شہر کے بینکوں میں جمع ہو رہی تھی۔ کسان ولا خالی ہو رہا تھا۔

لیکن ترزی شا کی مرگ ناگہاں کے دو سال بعد ہی اس کی چھوٹی لڑکی، جس کا نام رولاں تھا اور جس نے ولایت میں تعلیم پائی تھی، آ کر کسان ولا میں رہنے لگی۔ اس نے ولا کی مخملی دیواروں اور فرش کو' وہاں کے آبنوسی فرنیچر کو وقت کی گرد سے صاف کروا دیا۔ جا بجا لگے قد آدم آئینوں کو صیقل کروا لیا۔ چھت کے فانوس روشن کر لئے۔ دریچوں اور دروازوں پر پڑے ہوئے دبیز و مہین پردوں میں اس نے سنبھلنے کا دل رُبا انداز پیدا کر دیا اور اپنے دور دراز کے کچھ بھائی بندوں

اور کچھ نوکر چاکروں کے ساتھ وِلا کو پھر بسا لیا۔

پھر بھی اس کا مزاج نہ صرف کسان وِلا سے بلکہ اس سرسبز و شاداب وادی اور اپنے سارے ہی دیش سے بہت الگ تھا۔ اسے دیکھنے سے بھی یہ لگتا تھا کہ نرزی شنل نے کسی بدیسی صاحب سے مرعوب ہو کر اپنی وادی کی زرخیز زمین میں اُگے ہوئے ایک پودے کو اکھاڑ کر کسی بدیسی زمین میں لگوا دیا تھا اور وہ پودا غیر مانوس آب و گِل میں نشو و نما پا کر جوان ہوا تھا۔

رولاں سُرخ و سفید تھی۔ اُس کی آنکھوں کی نیلاہٹوں میں بہت ہی ہلکی ہلکی سبز رنگت تھی ــــ ان کو گرمانے والی سُرخیاں تھیں۔ ہونٹوں پر تھم تھم کر مسکرانے والی گدگداہٹ تھی ــــ یا پھر روشن جبیں سے تکرّدِ فہم کے غرور کا اظہار تھا۔ اس سرسبز وادی کو گھیری ہوئیں، اونچی نیلگوں پہاڑیوں کے اس پار اُتر جانے والی اس کی نظریں تھیں اور اُدھر کہیں دور اس کی نظروں کے مسکن تھے۔

دھواں ہی دھواں، خواب ہی خواب ــــ

اس نے ڈان وان کے خواب دیکھے تھے۔ پرنس آف ڈنمارک سے اپنے آپ کو بہت متاثر پایا تھا ــــ عطر و عنبر میں بسانے کی طرح کیٹس کی شاعری میں اپنے نازک سے نازک اور لذّت آمیز احساسات کو بسا لیا تھا ــــ میر و غالب کو پڑھ کر جسم و جان میں ہر قسم کی کسک اور لہک پیدا کر لی تھی ــــ عمر خیام کے خمارِ بے حساب کو اپنی روح اور اپنے بدن میں ایک بجلی کی طرح تڑپتا اور کوندتا پایا تھا۔

اپنے وِلا کے کچھ روشن اور کچھ دُھندلے اسرارِ رنگ و بو میں وہ اس طرح رہنے بسنے لگی تھی جیسے وہ بستی کی کسی خوشگوار کُٹیا میں رہنے والے ایک سرفروش نوجوان کی زندگی کا حسین ترین خواب ہو ــــ

دُھواں ہی دُھواں، خواب ہی خواب ــــ

یہ بھی کوئی خواب جیسا منظر تھا۔

وِلا کی بالائی منزل پر رولاں کی خواب گاہ میں اس وقت مدھم سی روشنی تھی ایک لیمپ جس کا شیشہ نیلا نیلا تھا، چھت سے لٹکا ہوا تھا اور ہلکی ہواؤں میں بہت ہلکے ہلکے ڈول رہا تھا۔ رولاں ایک مہین سا شب خوابی کا لباس پہنے، ایک کھڑکی سے لگی، دور پہاڑیوں کی طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے سامنے پھیلی ہوئی وادی میں وہ کسی کو تلاش کر رہی ہو۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کے پردوں کو اس طرح تھام رکھا تھا جیسے سہارا لے رہی ہو۔

عجیب خاموشی تھی۔

جہاں وہ کھڑی تھی وہیں، بالکل وہیں ایک سسکی سی سنائی دی۔ اس سسکی نے ماحول کی ساری فضاء کو متحرک کر دیا تھا۔ پیچھے لٹکے ہوئے لیمپ کی روشنی جیسے بھڑک اٹھی۔

لیمپ کو تھامے شبر اکھڑا تھا۔ چھریرے بدن کا نوجوان، چہرے سے کچھ ہراساں ہراساں آنکھوں پر بہت چوڑے اور نیلے فریم کی عینک، ہلکا اودا، ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا ہوا۔

سسکی کی آواز نے پہلے شبر کی آنکھوں کو لیمپ کی روشنی میں بہت پھیلا دیا پھر اس نے اپنے چہرے کو لیمپ کے قریب لے جا کر زیادہ واضح کر دیا۔ نیلے فریم کی عینک میں لگے ہوئے عدسے بھی نیلے لگ رہے تھے اور آنکھیں اپنے ہی اندر دیکھتی ہوئیں۔

"رولاں" ــــ اس نے کچھ اتنے دھیمے اور ٹھہرے لہجے میں کہا جیسے رو رہ

ٹھیک اسی گھڑی پر اس کی زبان سے یہ لفظ خود بہ خود ادا ہو جاتا ہے اور وِلا کی بڑی گھڑیال کے گھنٹے کی آواز کی طرح فضاؤں میں تیر جاتا ہے ــــ پھر اس نے لیمپ کی

بتی کم کردی۔ اچانک باہر کی ہلکی چاندنی خوابگاہ میں در آئی۔

"ہ ہ" "ہا" رولاں نے بنا شیرا کی طرف پلٹے کہا۔

"کیوں، کیا ہوا؟"

"میرا ایک عاشق تھا۔"

"تو کیا ہوا۔ میں نے بھی عشق کئے ہیں۔ پانچ۔ تم میرا چھٹا عشق ہو۔"

"نژاخ" سی آواز آئی۔ لیمپ کی بجھتی روشنی سے رولاں کی آنکھوں کی چنگاریاں زیادہ روشن نظر آئیں۔ اس نے ایک تھپڑ شیرا کے گال پر جڑ دیا تھا۔

شیرا کی عینک تو اس کی آنکھوں پر جمی رہی لیکن اس کا چہرا الیو ترا ہو گیا۔ اس نے لیمپ کی روشنی بڑھادی، رولاں پھر باہر جھانکنے لگی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور وقت دو قدم پیچھے لوٹ آیا ہو۔

اب ہوا کی سرسراہٹ بھی نہیں تھی، لیمپ بالکل ٹھہرا ہوا تھا اور روشن تھا۔ اسی وقت پہاڑ کے کسی بھی حصے سے اور کتنے ہی فاصلے سے اُس خوابگاہ کا وہ دریچہ نظر پڑتا ہو گا جس میں رولاں کھڑی ہوئی تھی۔

ایسے میں، یعنی بہت ہی ہلکے لاجوردی رنگ میں لہلہاتی رات میں دُور چاندنی کی مدھم سفیدیوں سے بنی ہوئی پگڈنڈی سے ایک شب رنگ گھوڑا وادی میں اُترتا اس طرح نظر آرہا تھا جیسے شہابِ ثاقب۔

ایک بے خطر سوار کی شبیہہ نظر آگئی ہے، اب قریب آرہی ہے۔ اب تو گھوڑے کی ٹاپوں میں زندگی بولنے لگی ہے۔ اب وِلا کی بیرونی گیٹ کے سامنے جیسے چاندنی یک لخت دھواں دھار ہو جائے گی، گھوڑا رک جائے گا اور ہر آواز کے ساتھ دل کی دھڑکن بھی گھڑی بھر کے لئے رک جائے گی۔

سناٹا تو چھا گیا لیکن اس سناٹے میں پھر رولاں کی ایک زور کی ہچکی سُنائی

دی، جیسے اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی صدا اب گیٹ سے گذر کر دور تک جا چکی تھی اور فضاؤں میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔

شبیرا نے یوں ہی کچھ سہمے ہوئے انداز میں روشنی کچھ اور تیز کر دی۔ اس بار روشنی زرد زرد تھی۔ رولاں کا جوان بدن چمک اٹھا۔ اس کے ہلکے روشن بدن پر یہاں وہاں خون کی ہلکی دھاریں نظر آنے لگیں۔ جیسے رخنے سے پڑ گئے ہوں ــــ شاید وہ کوئی زخم تھے۔

رولاں کی ہچکی نے یہ بتا دیا کہ وہ تھک چکی تھی، اس نے اپنے دو کچے زخم شبیرا کے سامنے کر دیئے۔ یہ اس کی خوبصورت آنکھیں تھیں جن کو شبیرا اپنی بڑی عینک سے بھی زیادہ پھیلی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔

"اُف ــــ!" رولاں نے اپنی اس آواز سے کسی درد کے احساس کو سنوارتے ہوئے کہا ــــ وہ ایک ٹک شبیرا کو دیکھ رہی تھی۔ اب اس کی آنکھوں کی سرخیاں لیمپ کی روشنی سے رنگ ملانے پر آمادہ ہونے لگی تھیں، اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم بھی آ گیا تھا، جس میں زردی سے زیادہ سرخی تھی ــــ اس کی پلکوں کی سیاہی بھی چمکنے لگی تھی۔۔

اس تبسم کے ساتھ اس نے کہا ــــ "شبی، تمہارا چہرہ کتنا لمبوترا ہے۔" وہ ہنس پڑی تو شبیرا کا چہرہ اور لمبوترا ہو گیا۔ رولاں نے کہا ــــ

"تم کتنے دبلے آدمی ہو، اس پر تمہارا رنگ ــــ اُف! جیسے ابھی پیدا ہوئے ہو۔ نہ کالا ــ نہ گورا ــــ"

شبیرا جو ابھی تک لیمپ کے قریب کھڑا ہوا تھا، لیمپ سے ذرا پرے ہٹ آیا اور اپنی آنکھوں کی نمی کو چھپانے کے لئے دم سادھے نیچے فرش پر بیٹھ گیا

بس بہت تعریف ہو چکی میری۔ ایک بات کہہ دو — ایک بار کہہ دو۔ اور صاف صاف کہہ دو — ''

یک لخت ہوا کے دو تین جھونکے ہنستے ہوئے دریچوں سے داخل ہوئے۔

'' یہ کس کا مذاق ہے — ؟ ''

رولاں دریچوں سے باہر آسمانوں کی طرف تھوڑی دیر گھورتی رہی۔ پھر اچانک شیرا کا ہاتھ پکڑ کر فرش پر بیٹھ گئی اور بولی —

'' تم کیا سمجھو گے — مجھ سے تھوڑے سے بڑے تو ہو گئے تم۔ لیکن کیا سمجھ سکو گے — دیکھو، تمھاری آنکھوں کی نمی بھی میرے دل میں ایک جذبہ کو ابھارتی ہے — اور وہ جذبہ ہے رحم کا — جذبۂ رحم سے بھی محبت جنم لیتی ہے — تم کو بھی چاہوں گی — تم کو بھی اپنا بناؤں گی — ''

اس نے شیرا کا ہاتھ چھوڑ دیا — شیرا نے نظریں جھکالیں۔

پھر اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی، دریچے کے پاس چلی گئی، اور کچھ اتنے زور کا قہقہہ لگایا کہ شیرا بھی سہم کر اٹھ کھڑا ہوا۔ رولاں نے بڑی ہی اونچی آواز میں شیرا سے اس طرح پوچھا، جیسے اپنے آپ سے پوچھ رہی ہو۔

'' سچ سچ بتاؤ، وہ سب کچھ کہاں ملتا ہے — کہاں ملتا ہے؟ '' اس نے شیرا کے شانوں کو پکڑ کر ہلانا شروع کیا ''۔ وہ سب کچھ کہاں ملتا ہے۔ جسے ہم کہتے ہیں سکون — خوشی۔ زندگی۔ اُف، میں نے کیا کچھ نہیں پایا اور کیا کچھ نہیں کھویا۔ لیکن نہ پانے میں کچھ ملا نہ کھونے میں — میں نے کیا کچھ کیا اور کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن نہ کرنے ہی میں کچھ ملا، نہ نہ کرتے ہی میں کچھ ملا — جانتی ہوں تم مجھے کتنی ترسی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہو، تمھاری نظروں میں کتنا کرب ہے، کتنا درد ہے، کتنا دردناک نشہ ہے اور اس نشے کی تہہ میں تم کتنے پیاسے

ہو ــــ بھوکے ہو، مجھے دیکھنے کے لئے، یہاں سے وہاں تک، آہ ــــ
وہ درِ دریچے کی طرف پلٹ کر باہر دور آسمانوں میں دیکھنے لگی۔
پتہ نہیں کیوں شبرا کو اس لمحے نے ایک ہمت بخش دی۔
"تمھارا یہ آبنوسی بدن!" اس نے کچھ ایسی آواز میں کہا، جیسے اُسے اپنی آواز پر کوئی قابو نہیں اور اس آواز کو وہ روک نہیں سکتا۔
"آبنوسی بدن!" پلٹ کر رولاں اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔
ہاں ــــ باہر کی ہلکی چاندنی جو نیلگوں پہاڑیوں اور وادیوں سے ہو کر یہاں تک پہنچ رہی ہے اور ان ارغوانی پردوں سے گذر کر اندر چلی آ رہی ہے، وہ ایک نامحرم خیال جیسا مدھم رنگ بکھیر رہی ہے اس کمرے میں ــــ اور اس رنگ میں تمھارا لباس کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔ صرف تم نظر آ رہی ہو، لباس سے دور تمھارے خدوخال ترشے ہوئے لگ رہے ہیں ــــ آبنوسی ــــ اس لئے میں یہ قندیل بجھا رہا ہوں ــــ"
ارغوانی پردے ہلے ــــ ہلکی سی، بہت ہلکی سی ٹھنڈی ہوا آئی، اور اس آبنوسی رنگ کے بدن کی حدت میں ایک احساسِ لذیذ پیدا کر گئی۔
کبھی کسی وقت کی لٹ میں پھولوں کی لڑی جس طرح اُلجھ جاتی ہے ایک ہنسی اُس ہوا کے جھونکے میں اُلجھ گئی ــــ رولاں نے آہستہ سے پوچھا۔
"میں بے لباس لگتی ہوں نا؟ ــــ لیمپ اور روشن کر دو ــــ"
"نہیں، میں لیمپ بجھا رہا ہوں ــــ"
"تم کو معلوم ہے میں شادی شدہ ہوں؟"
"مجھے معلوم ہے ــــ" اس بار شبرا کی آواز میں ایک بھرپور اعتماد تھا۔ رولاں پلٹی اور آنکھیں پھاڑ کر کچھ دیر اس کو دیکھتی رہی۔

"تم کو معلوم ہے میں نے کتنی شادیاں کی ہیں ؟"

"مجھے اس سے غرض نہیں ہے" شیرا اسی انداز میں بولا۔

وہ کچھ چونک پڑی، اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندوں کے ساتھ کچھ بل اُبھر آئے ۔ اس نے کہا ۔ "لیکن کیا تم یہ جانتے ہو کہ میں نے ساری ہی زندگی اُن ولایتی ملکوں میں کیسی گذاری ؟"

"میرے لئے تو تم ایک ایسا پھول ہو، جو ابھی ابھی کھلنے کو ہے ۔"

یہ غلط ہے ــــ یہ غلط ہے ــــ یہ غلط ہے شیّی ــــ تم کو کچھ نہیں معلوم ــــ میں جب پھول بنی تھی تو میری خوشبو ایک زہر بن کر میرے اندر اُتر گئی تھی ــــ وہ زہر اب میرے اندر ہے ــــ میری نس نس میں ہے ــــ میرے باپ نے میرے لئے لاکھوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ کیا کمی تھی مجھے ــــ بدیسی ملکوں کے ان رنگ برنگے جگمگاتے پُراسرار شہروں میں کیا کچھ نہیں تھا۔ پیسہ ہی پیسہ ۔ عیش ہی عیش ــــ بیروت اور پیرس کی رس بھری اور نشیلی راتوں نے مجھے جی بھر کر لوٹا ۔ ہیمبرگ میں ریپابان کی مدہوش راتوں نے میری نیم ہوشی میں میرے جسم کے ایک ایک عضو سے دادِ عیش حاصل کی، سُرور رہی سُرور، لذّت ہی لذّت لندن کی سوہو سرکس کی تو میں ملکۂ شب مانی گئی ۔ ڈنمارک ــــ گئی ۔ تو کوپن ہیگن کی عیاشیوں نے میری عریانیوں کو روند روند ڈالا ۔ پری زادے ملے، شہزادے ملے، خوبصورت، رنگیلے من موجی نوجوان، ساری شان مردانگی اور دیوانگی لئے ہوئے مجھے کیا کچھ نہ ملا ــــ لیکن ان سب کے ملنے کے بعد بھی وہ سب کچھ نہیں ملا ۔ جس کی مجھے ایک تلاش سی تھی ــــ آف..... میں...... میں......" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا اور رو پڑی ۔

شیرا کچھ نہیں بولا ــــ فضا، خاموش تھی اور لیمپ کی دھندلی روشنی میں

صرف سسکیاں سنائی دے رہی تھیں ـــ ایسا لگا کہ شیرا کے پاس ایک لفظ بھی ایسا نہیں تھا، جس کے کہنے سے رولاں کی تسلی ہو سکے۔ وہ چپ رہا۔ رولاں نے اپنے چہرے سے اپنے ہاتھ ہٹا لیئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جگہ خون نظر آ رہا تھا، جیسے اس کے اندر ایک زخم تھا جو کھل گیا تھا اور خون بہنے لگا تھا۔

اس کی آنکھوں سے خون کے دو قطرے ٹپکے۔ اس نے شیرا سے کہا ـــ

"ذرا لیمپ کی روشنی کم کر دو ـــ"

شیرا نے روشنی کم کر دی ـــ اب کمرے میں ہلکا سا دھندلکا تھا ـــ رولاں نے کہنا شروع کیا ـــ

"مجھے کوئی صرف یہ بتا دے کہ میں زندگی سے کیا چاہتی ہوں ـــ مجھے نہیں معلوم، مجھے کس چیز کی تلاش ہے ـــ لیکن مجھے تلاش ہے ـــ اس تلاش میں میں نے کتنے دل والوں کے دل توڑ لیے ـــ میں نے خوبصورت نوجوانوں کو خریدا ـــ میں نے اُن سے بیاہ کیا ـــ میں نے بن بیاہے بھی ان کے ساتھ رنگ بھری راتیں گذاریں ـــ لیکن .....

مجھے اونچے اونچے فن کار ملے، بڑے بڑے مفکّر و شاعر ملے، مصوّر ملے میرے لئے شعر کہے گئے۔ میری تصویریں بنائی گئیں ـــ میرے بُت تراشے گئے ـــ لیکن .....

میں تو اپنی تلاش میں بڑے بڑے قحبہ خانوں میں پہنچ گئی ـــ اپنی مرضی سے، اپنی خوشی سے بازاری عورت بن گئی ـــ کسبی ـــ لاکھوں کی رقم کی مالک ہو کر بھی میں نے اپنا سودا کیا اور اپنے گاہکوں سے اپنی اُجرت لی، اُن کی مار کھائی اُن کے ظلم سہے ـــ لیکن ....

اُف ! تم کہو گے میں کتنی بے شرم ہوں، بے حیا ہوں، فحش ہوں، گری ہوئی ہوں ۔۔۔ مجھ جیسی عورت سے تم کس طرح توقع رکھ سکتے ہو، کہ اپنے عاشق کے سامنے اس طرح بے باک باتیں کرے ۔۔۔ ہونہہ ! آج اس کمرے میں تم میرے ساتھ ہو تو میرے بدن پر لباس بھی ہے ۔۔۔ ورنہ.....

شیرا کے اندر بھی شاید ایک لیمپ بھڑک اُٹھا ۔ اس کی آنکھوں میں، اس کے گالوں پر، اس کے ماتھے پر جلی بُجھی، بھوک کے نشان تھے ۔۔۔ ہونٹوں پر جھلسا دینے والی پیاس کے داغ تھے اور اس کے سارے وجود سے ہلکی سیاہی لپٹی ہوئی تھی۔

رولاں نے شیرا کو اس کیفیت میں دیکھا تو اپنے لہجے میں ایک لذّت پیدا کرتے ہوئے بولی۔

"تم مجھے چاہتے ہو نا؟ میرے سارے وجود کو اپنا نا چاہتے ہو نا؟ تمہاری جلتی آنکھوں پر مجھے ترس آتا ہے۔ تمہارے سوکھے ہونٹوں پر ترس آتا ہے۔ تم کو میں پیاسا نہیں ماروں گی ۔۔۔ شاید تمہارے ہی پاس مجھے وہ سب کچھ مل جائے جس کے لئے میری روح ساری زندگی بھٹک رہی ہے۔"

شیرا پہلی بار بے قابو ہو گیا ۔ بے ڈھنگے انداز میں بولا ۔۔۔ بس رولاں بس ۔۔۔ یہاں دیکھو، بالکل یہاں۔ میری جان ہے۔ بس اسی وقت، اسی لمحے تم یہ جان لے لو ۔ بس اتنا رحم کر دو یا کرم، میری اس جان کو ۔۔۔ اِس پیاس کو نکال لو ۔۔۔"

رولاں کے سینے میں جیسے اچانک کچھ جل اُٹھا۔ اسے ایک تیز ہچکی سی آئی، اور یہ بات کہ "مجھ پر رحم کرو اور یہ جان لے لو ۔" اس کے اندر گونج گئی ۔۔۔ بس یہی بات تو تھی جو پہلی بار اس نے اس وقت سنی تھی جب کہ پہلے پہل وہ زندگی کا

تر و تازہ پھول بن کر کھل اٹھی تھی۔۔۔۔۔

"ایک خوبرو نوجوان تھا اس بستی کا ــــ گبرو کسان ــــ تیز و طرار ــــ شب رنگ گھوڑے کا شہسوار، سرپٹ دوڑاتا ہوا ۔ اس ولا کی گیٹ کے سامنے سے گذرتا تھا، مسکراتا ہوا ــــ ان ہی دنوں میں یورپ سے یہاں آئی ہوئی تھی اس شہسوار سے ملنے ــــ اس نے اپنی پہلی ہی نظر میں، پہلی ہی کرن سے، اپنے ہر انداز سے مجھ سے التجا کی تھی ــــ "رحم کرو: اور یہ جان لے لو۔" اور ان ہی لمحوں میں میری زندگی نے قسم کھائی تھی کہ میں اس کی جان لے لوں گی ــــ شاید اس بات کو کوئی وِش بھری پون لے اڑی تھی اور میرے باپ کے کانوں میں وِش گھول گئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر وہاں دور ایک گولی چلی تھی ــــ ایک چیخ گونج اٹھی تھی، پھر وہ چیخ ان وادیوں میں گونج کر کہیں ہمیشہ کے لئے کھو گئی تھی۔ اس کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا ان وادیوں میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جہاں سے آج رات بھی وہ شہسوار گھوڑے کو دوڑاتا ہوا اِس گیٹ تک آیا تھا اور یہاں سے ان ڈھلوانوں کی طرف اتر گیا تھا ــــ وہ شہسوار اِسی طرح عمروں یہاں سے گذرتا رہے گا اور میں اسے ڈھونڈتی رہوں گی ــــ لیکن دیکھو ــــ میرے سارے بدن کو نوچ ڈالو ــــ ایک بوند بھی خون نہیں نکلے گا ــــ میں پتھر ہوں، بالکل پتھر ــــ

میرے باپ نے اس محل کا نام کسان ولا رکھا تھا اور اس محل کے کسی تاریک تہہ خانے میں اس نے اپنے اندر کی کسی چیز کو ہمیشہ کے لئے دفنا دیا تھا اور برسہا برس جی گیا تھا۔۔۔۔

میں نے انتقام لیا ہے، میں نے اپنے اندر ایک رچی رچائی تہذیب کو تہہ و بالا کر ڈالا ــــ تاراج کر ڈالا ۔ دل و دماغ میں بنائے ہوئے محلوں کو اجاڑ ڈالا۔

اب ہر در، دریچہ بھائیں بھائیں کرتا ہے۔"

دو گھڑی بالکل سناٹا چھا گیا۔ لیمپ روشن تھا۔ رولاں کی یہ آواز جانے دل و جان کے کس گوشہ سے نکلی تھی — گہری — ایک درد کی کھینچی ہوئی گہری لکیر جیسی —

"آؤ شبّی! — مجھ سے قریب آجاؤ —"

شبرا کی آنکھوں میں آنسو تھے، شبرا کی سانسوں میں آگ تھی اور شبرا کی عینک کے عدسے سرخ تھے، شعلوں جیسے۔

رولاں نے اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا — "دیکھو، چاہو تو لیمپ کو اور روشن کر لو — یہ میرے بدن کا محل جو تم دیکھ رہے ہو نا؟ — بہت ہی خوبصورت در و دیوار ہیں اس کے — حسین محراب ہیں — یہ محل تمھارا بھی ہو سکتا ہے — رہ بس کر دیکھ لو —"

اچانک قہقہے سنائی دیئے۔

رولاں اس طرح ہنس پڑی جیسے اس کے سینے میں پھنسی ایک پھانس نکل گئی ہو —

شبرا اس طرح ہنس پڑا، کہ اسے لگا وہ نہیں، خوابگاہ کے در و دیوار اس کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں — دونوں نے زخم آلود اور آگ میں تپتی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ لیمپ ہلکے سے جھول گیا۔

لیمپ کی متحرک روشنی میں رولاں شبرا کے بہت قریب نظر آئی۔

ایک گہرے نشے اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری — "دیکھو شبّی تم اب اندر تک جل چکے ہو۔ دو گھڑی بعد تم مر جاؤ گے — آؤ — دیکھو یہاں — بالکل یہاں میرے اس لباس کا بند ہے — کھول لو — آہ —"

لیمپ جیسے بھڑک اٹھا۔ دھواں ہی دھواں نظر آیا۔

دُھواں ہی دُھواں، خواب ہی خواب —
لیمپ بجھ چکا تھا۔ خواب گاہ کے کھُلے دریچوں سے سرد ہوائیں آرہی تھیں، فرش پر رولاں لیے سُدھ اور بے لباس پڑی ہوئی تھی۔ رات کے نیچے کھچے اندھیرے پھیلتی ہوئی سفیدیوں سے اس کے بدن کو چھُپائے رکھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے — ••

بنا تھا مرا آشیاں بجلیوں میں

میرے لیے مشکل یہ تھی کہ ان لوگوں کی بیویاں آجاتی تھیں اور میں دھری کی دھری رہ جاتی۔ ورنہ ٹھسے ٹھاٹھ تھے لپنے بس عیش ہی عیش میں گذرتی تھی۔ اونچے قسم کے لوگوں کا ساتھ، بڑے ہی اچھے قسم کے کھانے، خوب ہنس بول لینے کے لئے قیمتی شراب، نرم گرم شاہانہ بستر، سرسراتے ہوئے ملبوس کا لمس تو میری کچھ عجیب سی کمزوری بن گیا تھا۔ ایسی لمس کے ساتھ ہی میں بے قابو سی ہو جاتی تھی۔ بُری طرح کھل کھلا اٹھتی تھی اور ٹھاٹھ دار لوگ میرے اس طرح کھل کھلا اٹھنے پر بالکل راولے ہو جاتے تھے۔

مجھے ایک یقین سا تھا کہ فطری طور پر میرا تعلق شہر کی اونچی سوسائٹی سے ہی ہونا چاہیئے اور ساتھ ہی مجھے اچھے کھانوں اور نرم گرم بستروں کا ایک ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ نچلے اور گندے قسم کے لوگوں کی طرف میں بڑی ہی حقارت کی نظر سے دیکھا کرتی تھی اور ایسا کرنے میں مجھے بڑا مزہ آتا تھا۔ مجھ میں یہ احساس شاید اس لیئے بھی پیدا ہو گیا تھا کہ مجھے معلوم تھا، میرا دادا ایک امیر آدمی تھا اس کی عیاشیوں کے قصّے میں نے بہت سنے تھے جو کہنے والے تو بڑے ہی طنزیہ اور مضحکہ اڑانے کے انداز میں کہتے تھے۔ لیکن مجھے بڑے دلچسپ لگتے تھے۔ سنتا ہے میرا دادا تھا بھی بڑا دلیر عاشق۔ وہ قصہ بڑا مشہور تھا کہ ایک رات وہ جان کی بازی لگا کر ایک فرنگی حسینہ کی خوابگاہ میں گھس پڑا تھا اور وہ حسینہ اس کی دلیری پر کچھ اس طرح مر مٹی تھی کہ اس ایک رات میں اپنی نیم روشن خوابگاہ میں اس نے اپنے عاشق کو سارے ولایت کی سیر کرا دی تھی۔ اور بھی کئی

الف لیلوی داستانیں میرے دادا سے منسوب تھیں۔ لیکن ان کا اکلوتا بیٹا یعنی میرا باپ بالکل نالید نکلا۔ پڑھنا لکھنا تو دور کی بات ہے جب دادا کی زندگی میں ہی گھر نیلام ہوا تو میرے باپ میں یہ سوچنے کی صلاحیت بھی نہیں تھی کہ اس کی زندگی کا کیا ہوگا۔ اس پر شادی بھی کر لی۔ پھر اپنی شادی کے بعد وہ درجہ بدرجہ اپنی زندگی کو نیچے کھینچتا رہا۔ جیسے حالات نے اس کی آنکھیں کھول دی ہوں اور وہ مساوات کا قائل ہو گیا ہو۔ پھر وہ مرا تو ہمارے پاس سوائے اونچے خاندانی احساس کے اور کچھ نہیں تھا۔ ماں بھی تھک ہار کر بیٹھ گئی۔ مجھے اسکول سے نکال لیا گیا۔ اب میرے کپڑوں میں بدبو بسنے لگی تھی۔ اس لئے کہ تاریک گلیوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ گندی سڑاند بھری نالیاں بہت قریب سے ہو کر گذرتی تھیں۔ لیکن میرے لباس کی بدبو کے ساتھ ایک کلی کی طرح کھلنے والے بدن کی خوشبو میری ڈھارس بندھایا کرتی اور یقین دلاتی رہتی کہ میں ان گلیوں کی نہیں ہوں۔

پھر ہوا بھی ایسا ہی ــــ وہ جو کہتے ہیں نا کہ جوہر کی قدر جانے جوہری یا بادشاہ بالکل سچ ہے۔ آ ہی گیا ایک بادشاہ ــــ بادشاہ ہی تو تھا خواہ کسی ملک کا ہو یا اپنے دل کا ــــ بس ایک لمبی تڑنگی جگمگاتی موٹر آئی۔ اور مجھے رنگین فضاؤں میں اڑا لے گئی۔ جن کے لئے میں پیدا ہوئی تھی ــــ موٹر تھی یا پریوں کا اڑن کھٹولہ شہر کی صاف ستھری بڑی بڑی سڑکیں شام کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں۔ سرخ و سبز نیلی اودی روشنیاں ــــ پھر میرے قریب میرے ناز اٹھانے والا بادشاہ جو مجھ پہ مرمٹ رہا ہو۔ اس پر عیش و نشاط سے بھرپور آنے والی رات کا تصور ــــ ان چیزوں کے لئے تو انسان پیدا ہوا ہے۔ ورنہ وہ تاریک گندی گلیاں، سڑتی ہوئی نالیاں ــــ چھی چھی پھر ان سڑی گلیوں میں رہنے والے لوگ بالکل نالی کے کیڑے لگتے ہیں ــــ تھو ــــ

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اڑنے والے اپنے قیمتی اور معطر لباس کو میں

میں نے ٹھیک کیا اور اپنے گھنے اور مغرور بالوں کو بڑے ہی امیرانہ انداز میں قابو میں کرتے ہوئے۔ اپنے آپ کو یقین دلایا کہ دراصل یہ ہے میرا مقام اور اس مقام کے لئے میں کس قدر موزوں شخصیت ہوں۔" اس خیال پر جب میں مسکرا پڑی تھی تو میرے بادشاہ نے مجھے بڑی ہی بدنیت شفقت کے ساتھ دیکھا تھا اس کی عمر کوئی چالیس پینتالیس سال کی ہوگی۔ لیکن لگتا بڑا ترو تازہ تھا۔ اس کے گول اور بھرے بھرے گورے چہرے پر زندگی کی صرف اونچی شکلوں کا عکس تھا۔ اس کی صاف ستھری سنہری مونچھوں میں ایک مخصوص امیرانہ دمک تھی اور اس کی آنکھوں کی چمک کو دیکھ کر وہی خیال آتا تھا جو ہیروں کو دیکھ کر آتا ہے کہ یہ بہت قیمتی ہیں۔

میری طبیعت بڑی ہی ترنگ میں تھی میں نے اپنے آپ پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور جی چاہا کہ وہ ایک مصرع جو یاد آگیا۔ ع

"اف تیری کافر جوانی ۔۔۔۔ " پڑھ کر بادشاہ کو بُری طرح ورغلا دوں لیکن اس سے پہلے ذرا ایک اچٹتی سی نظر ڈرائیور پر ڈالی۔ وہ بڑے ہی زور و شور سے موٹر چلا رہا تھا اس کے سفید جھک لباس کو دیکھ کر مجھے اپنا مقام کچھ اور اونچا لگا تھا۔ لیکن اس کی وہ پولیس افسروں کی سی ٹوپی اور ٹوپی سے نکلی ہوئی گھنگھریالے بالوں کی لٹیں اور اس کا وہ فلمی ہیروؤں کا سا انداز بڑا دلچسپ لگ رہا تھا۔ وہ ایک گورا چٹا نوجوان تھا۔ اس کے بھرے بھرے ہاتھ اسٹیرنگ پر بہت بھلے لگ رہے تھے۔ لیکن اس کے اچھی طرح شیو کئے ہوئے چہرے پر اس کی ٹھوڑی تاک کر دیکھ کر مجھے اپنی طبیعت کی ترنگ میں ایک ہلکی سی رکاوٹ محسوس ہو رہی تھی جسے میں بار بار اپنے بادشاہ کی طرف دیکھ کر دور کر رہی تھی۔

اس رات میرے بادشاہ نے اپنے محل کی ایک سجی سجائی ٹھنڈی ٹھنڈی عطر روشنیوں میں نہائی ہوئی آرام گاہ میں مجھے بار بار یقین دلایا تھا کہ جھونپڑی میں رہ کر

میں نے جو محلوں کے خواب دیکھے تھے وہ سچے تھے ۔ ان کی تعبیر یہی تھی ۔ جب میں نے نرم و ملائم ہلکا پھلکا شب خوابی کا لباس پہنا اور آہستہ خرام پر وقار انداز میں چلتی ہوئی بادشاہ کے سامنے آئی تو بادشاہ کا چہرہ ایک انجانی خوشی سے اس طرح کھل اٹھا جیسے اسے وہی شکل نظر آ گئی ہو ۔ جو اس کے خواب و خیال میں بسی ہوئی تھی ۔ اس نے کہا تھا تم تو واقعی وہی ہو جس کی تلاش میں میں اب تک زندہ ہوں ایک نرم نرم کوچ پر بیٹھے ہوئے اس نے میری طرف اپنے بازو پھیلا دیئے اور جب میں قریب آ گئی تو مجھے اپنی طرف کھینچ کر اپنے آپ پر گرا لیا ۔ ایسا کرنے میں میرا ہلکا پھلکا لباس کچھ ادھر ادھر ہو گیا ۔ اس کی نظروں میں ایک بجلی سی کوندی لیکن اس نے کہا ۔ " اچھا چلو پہلے تھوڑی سی پی لیں ۔ " اس نے جب شراب کا پیالہ میری طرف بڑھایا تو میں نے انکار ہی کیا ۔ نہ اپنا ہاتھ بڑھایا ۔ بلکہ اپنے باذوق ہونے کا ثبوت دینے کے لئے بڑے ہی شوخ انداز میں بادشاہ کی طرف مسکراتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پیالے پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے ۔ بادشاہ نے اپنا بھی پیالہ اٹھایا اور بجائے پیالوں کے ٹکراتے کے میرے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ ٹکرا دیئے ۔ بادشاہ نے اس رات بہت ساری شراب پی لی ۔ اور بالکل بچوں کی طرح میرے ساتھ کھیلنے لگا ۔ اس کی وہ پر وقار اور رعب دار شخصیت میری آغوش میں آ کر سمٹ سی گئی تھی ۔ حد یہ کہ وہ بالکل بچوں کی طرح دودھ پینے کے لئے ہمکنے لگا اور بڑی ہی دلچسپ شرارت کے انداز میں اس نے شراب کی بوتل اٹھا کر میرے سینے پر انڈیل دی ۔ اور دودھ پینے کے انداز سے بہتی شراب پینے لگا ۔ پھر اس نے بڑی ہی سرخ اور بدن کے اندر گھس جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا ۔

" تم کبھی شادی نہ کرنا ۔ شادی کے بعد عورت ، عورت نہیں رہتی ۔ صرف بیوی بن جاتی ہے ۔ " پھر ہنستے ہوئے اپنے بازوؤں کی گرفت اس نے اور مضبوط

کر دی اور بڑی ہی فراخدلی سے یقین دلایا۔
"ویسے تم اس سارے محل کی مالک ہو۔ میری مالک ہو۔ میری ساری زندگی کی مالک ہو......" اور پھر میں بادشاہ کے دل جیسے فراخ اور نرم گرم بستر پر پہونچ کر بادشاہ کی بادشاہت پر اپنا حق جتاتے ہوئے اپسراؤں کے دیش کی سیر کرانے والی مستیوں میں کھو گئی۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ بادشاہ تھک ہار کر سو چکا تھا۔ میری آنکھوں میں کہیں تھکن نہیں تھی بس تو اپنے ذہن میں اٹھنے والے ہر خیال سے سرشار تھی۔ میں نے اچانک محسوس کیا کہ میں اس سارے محل میں اکیلی ہوں اور اس محل کی مالک۔ دل میں ایک خواہش سی جاگی کیوں نہ محل کی سیر کروں۔ دیکھوں تو آخر یہاں میرے اختیار میں کیا کچھ ہے۔ اس وقت میں نے دیکھا خوابگاہ کے فرش پر مجھ سے تھوڑی دور بادشاہ کا لباس پڑا ہوا تھا۔ میرا لباس پڑا ہوا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی خوابگاہ کی ٹھنڈی مدھم روشنی میں میں نے اپنے آپ پر نظر ڈالی مجھے یقین تھا اس وقت کوئی اور مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ محل کے سارے خادم بہت پہلے محل سے باہر چھوٹے چھوٹے گھروندوں میں جا کر سو گئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر فرش پر پڑے اپنے ہوئے اپنے لباس کو یونہی اپنے پاؤں سے ذرا پرے ہٹا دیا۔ جیسے وہ میرے راستے میں حائل ہو رہا ہو۔ اور ڈریسنگ روم میں جا کر ایک خوبصورت سا گون پہن لیا۔ پہنا بھی تو ذرا لاپرواہی سے جیسے اپنی ہی آنکھوں سے اپنے بدن کو چھپانا ہے۔ پھر اطمینان سے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے میں اپنی خوابگاہ سے باہر نکل آئی۔

اس وقت میرے سامنے نچلی منزل کی طرف جانے والی بڑی ہی چکنی چوڑی سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں پر خر بزی رنگ کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا سیڑھیاں بھی کس قدر پروقار ہیں۔ بڑے بڑے محلوں کی شہزادیاں اور ملکائیں کس شان

سے ریلنگ پر اپنا نازک اور خوب صورت ہاتھ رکھے شاہانہ انداز سے سیڑھیوں
سے اترتی ہیں۔ میں بھی تو اس محل کی مالک ہوں، پہلی ہی سیڑھی کے ٹھیک
اوپر چھت میں لگا ہوا بجلی کا ایک خوشنما قمقمہ تھا۔ اس کی روشنی میں میرا
گوٹون جھلملا گیا۔ گوؤن بڑے ہی مہین سنہری تاروں سے بنا ہوا تھا۔ سنہرے
تاروں کے بیچ میرے بدن کی رنگت دمک رہی تھی۔ جو ان تاروں سے زیادہ
روشن لگتی تھی۔ میں بڑے ہی فاخرانہ انداز میں سنبھلے سنبھلے اور نپے تلے
قدم ڈالتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی۔ یہ سیڑھیاں نیچے ایک
بڑے ہال میں اترتی تھیں۔ ہال کی سجاوٹ دیکھ کر گھڑی بھر کے لئے میرے
قدم رک گئے۔ ہال بڑے ہی قیمتی اور خوبصورت فرنیچر اور نوادرات سے سجا ہوا
تھا۔ فرش پر بچھے ہوئے قالین کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ آگے بڑھوں گی
تو پھولوں پر چلوں گی۔ چھت سے لٹکتا ہوا فانوس بہت ہی دبیز تھا۔ لیکن جو
چیز میری تمام تر توجہ کا مرکز بن گئی تھی وہ ایک ننگی عورت کا مرمریں مجسمہ تھا
فانوس سے نکلنے والی روشنی اس کے ہر عضو کو چوم رہی تھی۔ میں اس مجسمے کے پاس
جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کسی بہت بڑے لیکن بھولے فنکار کا شاہکار لگتا تھا۔
اس کے ہر عضو میں جذبات کی شدت کا احساس ہوتا تھا۔ مجسمے سے قریب ہی باہر
وارڈ سے میں کھلنے والا دروازہ تھا اور دروازے کے قریب ایک قدِ آدم آئینہ
کچھ اس زاویئے سے رکھا ہوا کہ ہال کے اندر داخل ہونے والا اس میں اپنا عکس
دیکھ سکتا تھا۔ میں اس آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ آئینے میں اپنے عکس کو
ایک بھرپور نظر سے دیکھا۔ پھر سارے ہال پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور دوبارہ
اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنے گوؤن کے بٹن کھول دیئے۔ یہ رسیلا
چمکتا بدن حسن و شباب کے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ یہ مجسمہ کس کا شاہکار ہے"؟ اس
خیال کے ساتھ ہی ایک غرور و ناز کے احساس نے میرے اندر میں ایک البیلا دلکش ترنم

پیدا کر دیا جسے دیکھ کر میں مسکرا پڑی اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر ورانڈے میں نکل آئی۔ ورانڈے میں ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں ورانڈے کے چمکیلے گول اور اونچے سیاہ ستون بڑے پرشکوہ لگ رہے تھے۔ جی چاہا تھوڑی دور آگے بڑھ جاؤں اور ورانڈے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر کر باغ میں چلی جاؤں اور شبنم میں بھیگے ہوئے سبزے پر تھوڑی دیر چہل قدمی کر لوں باہر ہلکی ہلکی چاندنی تھی ٹھنڈی ہوا کا ایک معطر جھونکا میرے بدن کو چھو کر گذر گیا۔ میں نے بڑے ہی سکون کا سانس لیا اور باغ کی طرف اترنے والی سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے تھے کہ پیچھے سے کسی کی آواز آئی۔

"ادھر مت جائیے"

میں سہم سی گئی۔ پلٹ کر دیکھا۔ ڈرائیور کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنے کھلے کھلے ادھورے سے لباس پر نظر ڈالی اور اسے ٹھیک ٹھاک کر لیا۔ شاید وہ مسکرا پڑا تھا۔ اس مدھم نیلی روشنی میں اس کے چہرے کے نقوش تو صاف نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اس کی کھڑی ناک اب بھی نمایاں تھی۔ وہ باادب کھڑا ہوا تھا۔ اس لئے بھی میری ڈھارس بندھی۔ ویسے میرا دل زور سے دھڑک رہا تھا لیکن میں نے اپنے لہجے میں خادموں کو مخاطب کرنے کا انداز پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کیوں ادھر کیوں نہیں جانا چاہیئے؟"

اس نے بھی مجھ سے مرعوب ہونے کے انداز میں کہا۔ "سیڑھیوں سے نیچے بائیں طرف رات کی رانی ہے جہاں راتوں میں ایک ناگن رہتی ہے۔"

ناگن کا نام سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں ایک قدم پیچھے ہٹ آئی۔ لیکن یہ سوچ کر کہ شاید وہ مجھے یوں ہی ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے کہا "میں ناگن سے نہیں ڈرتی ٹھیک ہے جاؤ تم سو جاؤ۔"

"میں اب کس طرح سو سکتا ہوں" اس نے ذرا تفصیل سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مالک کو اگر معلوم ہو گیا کہ میں جاگ رہا تھا تو مجھ پر غصہ کرے گا کہ میں نے آپ کو نیچے جانے سے منع کیوں نہیں کیا۔"

اس کی باتوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کچھ تحکمانہ لہجے میں کہا "اچھا جاؤ تم سو جاؤ مالک کو معلوم نہیں ہو گا کہ تم جاگ رہے تھے"۔

اس نے کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے لیکن باہر بہت ٹھنڈک ہے اور آپ کا یہ مہین لباس۔ سردی لگ جائے گی"۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے میرے لباس کے اندر مجھے دیکھ لیا ہو۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اب بجائے واپس اس کی طرف جانے کے دو قدم سیڑھیوں کی طرف چلی جاؤں میں نے سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ اس نے اچانک اپنا لہجہ بدل کر کہا۔

"تو تم میری بات نہیں مانو گی"۔

اس کے اس تیز لہجے پر اور خصوصاً مجھے "تم" سے مخاطب کرنے پر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں تڑپ کر پلٹی کہ اس پر برس پڑوں لیکن وہ مجھ سے بہت قریب آ گیا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا سینہ اور اس کے مضبوط بازو دیکھ کر میں چپ ہو گئی اور واپس لوٹتے ہوئے کہا۔ "تم کو اس تمہاری اس بدتمیزی کا مزہ کل صبح چکھاؤں گی"۔ اور میں ہال کی طرف بڑھ گئی۔ لیکن پھرتی سے آگے بڑھ کر وہ میرے سامنے آ کھڑا ہو گیا اور مجھے نیچے سے اوپر دیکھتے ہوئے بڑے ہی پر اعتماد لہجے میں کہنے لگا۔ "جانتی ہو مجھے سیزر کہتے ہیں۔ سیزر نے قلوپطرہ کو فتح کیا تھا" اس کے بکھرے ہوئے کالے گھنگریالے بال وراندے کی ہلکی نیلگوں روشنی میں چمک رہے تھے اس کے چہرے کی ہلکی ہلکی سرخی میں دمک آ گئی تھی اور اس کی کنچالی آنکھیں مجھ سے بہت قریب تھیں ویسے میں غصہ میں تلملا رہی تھی۔ میرے ہونٹ کانپ رہے تھے اس کے باوجود اس

نے بڑے ہی مطمئین لہجے میں کہا۔

"کل صبح تم میری جان لے لو۔ لیکن آج کی رات مجھے زندگی دے دو" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس کے گال پر ایک زور کا طمانچہ مارا۔ تب اس نے لپک کر مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ پتہ نہیں کیوں میں چیخ نہیں سکی۔ جانے کیوں ایسا خیال آیا کہ بادشاہ جاگ جائے گا تو مجھے محل سے باہر پھنکوا دے گا۔ میں دبی آواز میں احتجاج کرنے لگی۔ "چھوڑ دے مجھے۔ ورنہ تو بہت پچھتائے گا میں تجھے جان سے مار دوں گی...." لیکن اس طرح اس کے بازوؤں سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش میں میرا لباس اِدھر اُدھر ہو گیا۔ میں ایک ہاتھ بڑھا کر اس کے سر کے بال نوچنے لگی تو اس نے سر جھکا کر اپنے ہونٹ میری چھاتیوں پر رکھ دیئے۔ میں آگ بگولہ ہو گئی۔ اس نے پوری قوت سے مجھے اپنے بازوؤں میں دبا لیا اور تیزی سے سیڑھیوں سے اتر کر لان پر آگیا اور اس کی گیلی گیلی گھاس پر مجھے ڈال کر بری طرح مجھ سے چمٹ گیا اور دیوانہ وار بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے بڑی ہی بے رحمی سے اس کے بال نوچے موقعہ مل گیا تو طمانچے مارے۔ اس کی باہوں میں اپنے دانت دھنسا دیئے۔ لیکن وہ صرف پیار کرتا رہا اور کہتا رہا۔

"میں جوان ہوں مجھے چاہو۔ میں مرد ہوں مجھے چاہو...."

ایک بار جب میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے بال پکڑ کر نوچے تو اس نے کچھ اس طرح اپنے ہونٹوں میں میرے ہونٹوں کو دبا لیا کہ میں نڈھال سی ہونے لگی۔ اس کی وہی کھڑی ناک میری ناک پر سوار تھی۔ میرے گاؤن کے سارے بٹن کھل گئے تھے اور میں بالکل ننگی ہو چکی تھی۔ میرے سارے بدن میں غصے اور نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ لیکن میرا وہ کونسا جذبہ تھا جو اس غصے کی اور نفرت کی شدت میں بھی اندر ہی اندر مجھ سے دغا کر رہا تھا اور میرے اپنے بجائے

کے لئے ابھرنے والی قوتوں کو روکے ہوئے تھے۔ میں بے بس تو تھی لیکن کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا تھا کہ میں بے بس نہیں بھی ہوں۔ بس اتنا سوچ رہی تھی۔ "یہ لوگ کتنے نمک حرام ہوتے ہیں۔ جانور ہوتے ہیں ——— حرامخور —— ذلیل —— کتنے۔ کمینے ——— حرامخور —— ذلیل —— کتے ——

جب میں وہاں سے اٹھ کر جانے لگی تو وہ میرے سامنے ایک سامنے ایک سیر شدہ وحشی کی طرح چپ چاپ کھڑا تھا۔ جب میں واپس سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی تو وہ چپکے چپکے سے میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنا سر جھکا دیا۔ مجھے یاد ہے سحر سے کچھ پہلے کی ہلکی ہلکی پھیکی چاندنی میں کھڑا ہوا وہ بھی کوئی مجسمہ لگ رہا تھا —— اس نے بڑی ہی سلجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"قلوپطرہ تم سے زیادہ حسین نہیں ہوگی ——— تمہارے زیر نگیں تو ایک نہیں کئی سیزر اور کئی مصر ہونے چاہئیں۔"

لیکن میں نے بڑے ہی حقارت آمیز انداز میں جواب دیا ——— "ہٹ جا کمینے۔ مجھے جانے دے۔"

وہ بڑی ہی عاجزی سے کہنے لگا۔ "بس ایک بات سنتی جاؤ۔ اب تم چاہو تو میری جان لے سکتی ہو۔ میں اب سچ مچ مرنے کے لئے تیار ہوں ——"

میں نے شدید حقارت کا اظہار کرتے ہوئے "ہونہہ" کہہ کر اس کی طرف تھوک دیا۔ اور اپنے لباس کو سنبھالتے ہوئے تیز تیز قدموں سے خوابگاہ کی طرف چلی گئی۔

خوابگاہ کے اندر پہونچنے پر مجھے محسوس ہوا کہ میں پوری طرح محفوظ ہوں۔ وہ غصہ، وہ ملال جو میرے دل و دماغ میں اک آگ لگائے ہوئے تھا شراب کے اترتے نشہ کی طرح غائب ہونے لگا میں نے محسوس کیا کہ اب میں واقعی بڑی طرح تھک چکی ہوں۔ سارے بدن میں ایک ایسی تھکن تھی جو شانہ بدن کے صبح

استعمال کے بعد پیدا ہو جاتی ہے۔ انتر تے سیاہ بادلوں کی طرح نیند مجھ پر چھانے لگی بہ مشکل میں نے فرش پر پڑا ہوا اپنا شب خوابی کا لباس پہنا اور بستر کی طرف بڑھی میری نظروں کے سامنے بادشاہ اسی طرح بے سُدھ سویا ہوا تھا۔ اُس کا بدن کچھ پھیلا پھیلا، ڈھیلا ڈھالا سا لگا۔ میرا تھکا بدن تو چاہتا تھا کہ اس نرم و گرم بستر پر ڈھیر ہو جاؤں۔ لیکن نہ جانے کیوں اس بستر پر بادشاہ کے قریب لیٹنا مجھے اس وقت اچھا نہیں لگا۔ میں چپکے سے کوچ پر جا کر ڈھیر ہو گئی۔

بادشاہ کے محل میں میں نے بڑی ہی شاندار حکومت کی۔ محل کے سارے خدام کچھ اس طرح میری خدمت کرتے تھے جیسے ان کو یقین تھا کہ میں بہت ہی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ بس ذرا سیزر سے میں دُور دُور رہا کرتی تھی میں نے کبھی اُسے لمحہ بھر کے لئے بھی مجھ سے تنہائی میں ملنے کا موقع نہیں دیا۔ کتنی ہی بار میں نے یہ طے کیا کہ اُس سے انتقام لوں اور اُسے ایسی سزا دلواؤں کہ اس کی وہ اونچی ناک زندگی بھر کے لئے نیچی ہو جائے اور ایسے کئی مواقع آئے بھی لیکن میں اپنی زندگی کی ہلہ گُلہ یا نیرنگیوں میں کچھ اس طرح کھوئی رہی کہ اس سے انتقام لینے کے لئے کوئی موزوں وقت نکال ہی نہیں سکی۔ مجھے اپنے اس جذبۂ انتقام کی تہہ میں ایک عجیب سی گدگدی سی محسوس ہوتی تھی اور میرے انگ انگ میں ایک ایسی لذت گھل جاتی جس کی جیسے میں خواہشمند تھی اور ایسے لمحوں میں جبکہ میں زندگی کی آسائشوں اور جسم و جان کی بے پناہ لذتوں کے ہجوم میں گھری ہوئی تھی میرے ذہن میں یہ خیال ایک مدھم سی روشنی کی طرح گھڑی بھر کے لئے چمک جاتا تھا کہ میں نے دراصل اندر ہی اندر اُسے معاف کر دیا ہے۔ مجھے کبھی اپنا یہ خیال ناگوار بھی گذرتا اور کبھی اس خیال پر ہنسی بھی آ جاتی تھی۔

قریب دو مہینے میں نے بادشاہ کے محل میں حکومت کی۔ صبح اس طرح جاگتی تھی جیسے تر و تازہ فضاؤں میں کلی چٹکتی ہو۔ شام اس طرح سجتی تھی جیسے زندگی ساری رعنائیوں

نے مل کر میرا سنگھار کیا ہو۔ بادشاہ کے سارے ہی دوست امیر تھے۔ خوبرو اور دلکش تھے۔ بادشاہ نے مجھے بڑے ہی اونچے ہوٹلوں کی سیر کرائی، میں بادشاہ کے دوستوں سے کچھ اس طرح بے باکانہ انداز سے ملنے لگی تھی جیسے اونچی سوسائٹی کے آداب و اطوار مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ میں نے تھوڑی بہت انگلش بھی سیکھ لی تھی۔ اُن سب کی نظریں جو نہ صرف مجھے دیکھتی رہتیں بلکہ باضابطہ میرے بدن کے ہر عضو کو چھوتی رہتیں، مجھے اس بات کا پورا یقین دلا دیا کرتیں کہ اُن کو مجھ سے زیادہ اور کسی چیز کی خواہش نہیں۔ میں تو جانے کتنی ہی بے خواب آنکھوں کا خواب بن چکی تھی ایک ایسا خواب جو حقیقت بن جائے تو پھر کوئی اور خواب دیکھنے کی تمنّا ہی نہ رہے۔

مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں بڑی ہی مثالی دلیری کے ساتھ میدانِ جنگ میں کود پڑی ہوں۔ میں اپنے سارے سامانِ حرب سے پوری طرح لیس غنیم پر کچھ ایسا قاتلانہ وار کرتی کہ غنیم دو گھڑی میں سپر ڈال دیتا۔ سرنگوں ہو جاتا ـــ مرد اور عورت میں اور ہوتا ہی کیا ہے۔ ایک جنگ ہی تو ہوتی ہے اور یہی وہ جنگ ہوتی ہے جو حیوانی جبلت اور زندگی کی بقا کی ضامن ہوتی ہے صلح و آشتی ہوگی اُس مرد اور عورت میں جنھوں نے اپنے خون میں کسی خوف کی برف گھول لی ہو ـــ ورنہ اُف رے وہ آتش فشانی لاوے جیسا اُبلتا ہوا خون اور یلغار پر یلغار کرنے کے حوصلے ـــ زخم پر زخم کھائے بیٹھے کاٹ پر کاٹ چل رہی ہے دشمن دشمن پر ٹوٹ کر وار کر رہا ہے زندگی ازرم ہی رزم ہے۔

میری زندگی امن اور شانتی سے کوسوں دور تھی اور محفوظ تھی۔ میں اُن دنوں کچھ اس طرح محوِ سفر تھی کہ کہیں کوئی منزل قبول کرنے کا مجھے خیال تک نہ آتا تھا۔ آسمان کی اُن بلندیوں میں اُڑتی تھی جہاں پہونچ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ستاروں سے آگے ابھی اور کتنے ہی جہاں آباد و منتظر ہیں۔

ایک دن بادشاہ نے بڑے ہی گھبرائے ہوئے انداز میں مجھے اطلاع دی کہ اس

کی بیوی واپس آ رہی ہے۔ اس کی بیوی کسی رشتے کے بھائی کے ساتھ سوئٹزرلینڈ
کی سیر کے لئے گئی ہوئی تھی۔ جب بادشاہ نے مجھے یہ بات سنائی تو مجھے کچھ اچھا ہی
لگا اور ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے اپنی بلندیوں پر اڑتے ہوئے ایک اڑن کھٹولے
سے دوسرے اڑن کھٹولے پر قدم رکھ دیا ہے جو اندر دیش کی طرف جا رہا تھا۔ میں
سچ مچ اندر کے محل میں پہونچ گئی تھی۔ وہ اندر دیوہی تو تھا، ساری پریوں کے جھرمٹ
میں گھرا ہوا۔ لیکن وہ سب نرتکیاں تھیں اور اسنے مجھے اپنے قریب سنگھاسن پر
بٹھایا تھا۔ اور جب ایک محفل نغمہ وسرود ختم ہو گئی تھی اور ساری نرتکیاں
چھپاتی ہوئی دور چلی گئی تھیں تو اسنے آکاش کی ہلکی ہلکی دمکنے والی نیلاہٹوں میں
مجھے اپنے قریب بٹھا کر امرت پلا دیا تھا اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں امر ہو گئی ہوں میرے
سارے بدن میں ایسی آگ لگ گئی تھی جو شاید کبھی بھی نہ بجھ سکے۔

مجھے کبھی ہلکا سا خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ اندر کے محل میں بھی کبھی کوئی ڈائن
بیوی کے روپ میں آجائے گی پھر بھی میں نے اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا
اور ہواؤں میں تیر گئی تھی۔ اندر نے مجھے بڑی ہی سبک رو اور عنبریں ہواؤں میں اپنے ساتھ
اڑاتے ہوئے آکاش کی نیلاہٹوں سے دھرتی کے سبزہ زاروں میں ایک محفوظ مقام پر
اتار دیا تھا اور خود آسمانوں کی طرف واپس اڑ گیا تھا۔

دھرتی پر اترنے کے بعد بھی میرے قدم دھرتی پر ٹکتے ہی نہ تھے لیکن دو مضبوط
ہاتھوں نے مجھے کچھ اس قوت سے نیچے کی طرف کھینچا کہ میں تقریباً زمین میں دھنس گئی
مجھے نیچے کی طرف کھینچنے والا خود ایک خطۂ زمین تھا۔ چٹان جیسا مضبوط بدن،
سوکھی زمین جیسا سخت چہرہ، اس کے پسینے میں مٹی کی سوندھی سوندھی بو آتی تھی۔ اس
کی شخصیت دور دور تک پھیلی ہوئی لگتی تھی۔ طبیعت تو بڑی ہی گل و گلزار قسم کی پائی
تھی۔ بڑا ہی لطیفہ باز تھا وہ جی میں گدگدی پیدا کرنے والی باتیں کرتا تھا۔ پہلی ہی ملاقات

میں اُس نے مجھ سے کہا تھا۔

"دنیا میں آج تک صحیح معنوں میں صرف دو مرد پیدا ہوئے ہیں، ایک میں اور دوسرا سکندر اعظم ——— اس نے جو ملک گیری میں جوہر دکھائے ہیں، وہی جوہر میں نے زن گیری میں دکھائے ہیں۔ مجھے بھی تاریخ یاد رکھے گی ———" یہ کہہ کر اُس نے مونچھ پر تاؤ دیا تھا اور ہنس پڑا تھا۔ پھر مجھ سے قریب آ کر بولا تھا "میری چھ بیویاں ہیں۔ اور ہر ایک کے لئے میں نے الگ الگ محل بنا دیا ہے لیکن ان محلوں سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے اس لئے کہ ہر محل کے در و دیوار سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ اور اپنی اس دولت سے میں وہ زندگی خرید نہیں سکتا جو مجھے سکون دے سکے ......"

آدمی تھا بھی اپنی جگہ ایک عجوبہ ——— دن بھر بات بات میں بات نکال کر خود ہنستا اور مجھے بھی خوب ہنساتا رہتا ——— میں تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی ——— لیکن رات میں وہ بالکل ہی بدل جاتا۔ خصوصاً شراب پی کر تو وہ بے حد سنجیدہ ہو جاتا بلکہ فلسفیوں کی طرح دیوانہ، دیوانہ سا لگتا ——— مجھ سے کہتا۔

"محل تو تمہارے لئے بھی بنا سکتا ہوں۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ محل بنتے ہی تم بھی کہیں بیوی نہ بن جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ان محلوں کی در و دیوار میں قید ہو جاؤ ——— انسان کو تو بالکل آزاد جینا چاہیئے۔ اس کے وجود کو ہر قید سے آزاد ہونا چاہیئے ——— جانتی ہو انسان نے اس دنیا میں آنے کے بعد سب سے بڑی غلطی یہ کی اس نے کپڑے پہن لئے اور وہ مہذب ہو گیا۔ مہذب ہونے کے بعد تو لازمی تھا کہ وہ تباہ ہو جائے۔ سو ہو گیا ———"

ایسی باتیں کرتے ہوئے وہ شراب کے ایک ساتھ دو تین گھونٹ پی لیتا اور مجھے بڑی ہی وحشیانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا ———

"چلو چلو، جنگل کی طرف چلو ہم جنگل میں جا کر رہیں گے جہاں صحیح معنوں میں ہم غیر مہذب یعنی صحیح معنوں میں آزاد ہو جائیں گے۔ میں جب تک اس طرح بالکل آزاد نہ ہو جاؤں میری روح کو، میرے بدن کو کبھی سکون نہیں ملے گا۔ کبھی نہیں۔۔۔"

اور وہ واقعی روز صبح ہی صبح مجھے اپنے ساتھ لیئے شہر سے دور ایک جنگل میں چلا جاتا۔ وہ جنگل بہت گھنا تھا اور ایک پہاڑ کے دامن میں تھا۔ اس نے وہاں ایک بہت ہی دلکش مقام ڈھونڈ رکھا تھا۔ پہاڑ کے ڈھلوان پر تیزی میں بہتا ہوا ایک جھرنا، جھرنے کا شوخ اور کھلکھلا کر ہنستے والا پانی۔ ایک مقام پر آکر ایک دم چپ ہو جاتا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا رتیلا گڑھا تھا جس کی گہرائی شاید گھٹنوں سے بھی کم تھی۔ اس گڑھے کے ٹھیک اوپر دو چٹانیں اس طرح کھڑی ہوئی تھیں جیسے دو سیاہ بدن ایک دوسرے سے بری طرح لپٹے ہوتے ہیں اور ایک کے ہونٹ دوسرے کے ہونٹوں میں پیوست ہیں، ان چٹانوں نے اس ریتلے گڑھے کے اوپر ایک کمان سی بنا دی تھی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پہونچ کر وہ بالکل جانوروں کی طرح معصوم بن جاتا اور مجھ سے کہتا۔۔۔ "چلو اب ہم پوری طرح غیر مہذب بن جائیں۔ تم پہلے چٹان کی اس طرف چلی جاؤ۔۔ میں ادھر رہوں گا۔ اور پھر جب ہم ایک دوسرے کے سامنے آئیں گے تو بالکل اس جنگل کے جانور بن کر۔ پھر ہمارے بدن پر تہذیب کا کوئی نشان نہ ہوگا" وہ جانور کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑتا، اور مجھے پانی میں دھکیل دیتا خود بھی پانی میں گر پڑتا اور مجھ سے لپٹ جاتا اور کہنے لگتا۔۔۔ "بس یہی انسان کا اصلی مقام ہے۔ ہم۔۔۔ ہم یہیں رہیں گے۔۔۔ یہیں جیئں گے۔۔۔ یہیں مرینگے۔۔۔ یہیں مرجائیں گے۔۔۔ یہیں مرجائیں گے۔"

جب ہم دونوں کے بدن پانی میں بری طرح بھیگ جاتے اور سردی ہونے لگتی تو وہ کہتا "سردی کا علاج لباس نہیں۔ سردی سے بچنے کے لئے آگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چلو میں آگ

جلاتا ہوں۔ ہم آگ تاپینگے لیکن کپڑے نہیں پہنیں گے۔۔۔" اس طرح اس جنگلی کے ساتھ کچھ عجیب سے دن گذر رہے۔

ایک شام ہم دونوں اس کے مکان کے ٹیرس پر بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ اس وقت وہ میرے حُسن اور میری جوانی کی کچھ ایسے سنہرے اور روپہلے الفاظ میں تعریف کر رہا تھا کہ میں تو سچ مچ اس ٹیرس کی بلندی سے نیچے پھیلے ہوئے سارے شہر کو، ساری زمین کو زمین پر رہنے والے سارے انسانوں کو بڑی ہی ہمدردانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ یہ ساری دنیا والے زندگی کی لذّتوں سے کس قدر محروم ہیں ـــــ وہ میرے بدن کے ایک ایک عضو کی تعریف کچھ اس طرح کئے جا رہا تھا ـــــ "یہاں ... یہاں سے زندگی کا رنگ پھوٹتا ہے ـــــ یہاں سے زندگی کا لوز لٹایا جاتا ہے۔ یہاں سے مسرتیں تقسیم ہوتی ہیں یہاں سے مجھے ہستیوں کی خیرات ملتی ہے اور یہاں ـــــ یہاں آکر مجھ جیسے سرکشوں کا سر خم ہو جاتا ہے ـــــ" اس نے میرے سامنے سر جھکا دیا۔ اس لمحے میری مدہوش نظر نے اوپر آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستاروں کا احاطہ کر لیا اور مجھے خیال آیا ـــــ "شاید ایک دن یہ سارے ستارے میری اقلیم میں آکر میرے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔ پھر اچانک اس نے مجھ سے کہا ـــــ "چلو، چلو، ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم کسی گھر میں، کسی محل میں نہیں رہ سکتے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میری پوری چھ بیویاں ایک ساتھ کسی رات اس مکان پر یلغار کرنے والی ہیں۔ چلو ہم کہیں اور چلیں جہاں کوئی عورت بیوی کی شکل میں نظر نہ آئے ـــــ" پتہ نہیں کیوں اسی رات وہ مجھے شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں لے آیا۔ لگتا تھا اس نے کچھ پہلے ہی سارا انتظام کر لیا تھا۔ میرے لیئے اس نے اس ہوٹل کا شاید سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے زیادہ موڈرن سوٹ بک کروالیا تھا ویسے میں اس ہوٹل میں اس سے پہلے کئی بار آچکی تھی لیکن جس سوٹ میں میں نے آج قدم رکھا تھا وہ شاید اس دنیا کے رہنے والوں کے لئے نہیں بلکہ آسمانوں سے اُتر کر آنے والی اپسراؤں

ے لئے بنایا گیا تھا جو کبھی کبھی دنیا کی سیر کرنے کے لئے آکر یہاں قیام کرتی ہوں گی۔

رات بھر میں اپسرا بنی رہی۔ دنیا جہاں سے بےخبر۔۔۔ ساری رات کچھ انجانی مدہوشیوں میں گذری۔ صبح اُس نے مجھ سے کہا۔۔۔ "اب تم یہیں رہنا۔۔۔ میں روز آجایا کروں گا۔۔۔ میں نے یہاں تمہارے لئے سارا بندوبست کر دیا ہے ہم جنگل کو بھی جائیں گے تو یہیں لوٹ کر آئیں گے۔۔۔" وہ چلا گیا۔۔۔ مجھے بعد میں یہ معلوم ہوا کہ ہوٹل کے جس حصے میں میں ٹھہری ہوئی تھی وہاں صرف بیرونی ممالک کے کروڑوں روپیوں کی تجارت کرنے والے تاجر آکر ٹھہرتے ہیں۔ شاید جنگلی نے میری تقدیر کا لکھا پڑھ لیا تھا جو میری زندگی کو اس ہوٹل تک لے آیا تھا جنگلی نے اس طرح مجھ پہ بہت بڑا احسان کیا تھا۔

اس ہوٹل میں ابھی دو دن بھی نہیں گذرے تھے کہ مجھے فرڈی مل گیا۔۔۔

فرڈی! یہ لفظ آج بھی میری زبان پر آجاتا ہے تو میرے اطراف کچھ عجیب عجیب رنگوں کا ایک ہالہ سا بن جاتا ہے وہ میری زندگی کا پہلا اور آخری خواب تھا یا پھر وہ میرے اس خواب کی تعبیر تھا جس کے بعد میں پھر کبھی کوئی خواب دیکھنا نہیں چاہتی۔۔۔ میرا ہم عمر۔۔۔ وقت کے آئینے میں نظر آنے والا میری ساری خواہشوں اور تمناؤں کا عکس۔ اس کا بدن میرے اپنے کنوارے ارمانوں کے سانچے میں ڈھلا ہوا لگتا تھا۔ اُس کی رنگت میرے اپنے جذباتِ رنگیں کی دی ہوئی تھی اس کا روم روم خوش رنگ میری آنکھوں کی روشنیوں اور مستیوں میں ڈھلا ہوا تھا۔

اُف رے فرڈی! میری زندگی میں آیا بھی تو کس جاہ و حشم کے ساتھ، کس طمطراق اور طنطنے کے ساتھ۔ ایک وجیہہ اور خوبرو شہسوار کی طرح دندناتا ہوا آکر میرے وجود کی ساری وسعتوں کو فتح کر گیا۔ بس پل بھر میں جیسے رنگ و نور کا ایک طوفان آیا تھا اور میرے سارے وجود کو اپنے ساتھ سمیٹ لے گیا تھا وہ لمحہ کیسا تھا جب میں نے اپنی آنکھوں کو کئی بار جھپکا جھپکا

کر دیکھا تھا کہ میری سلطنتِ حیات کے تخت پر وہ ایک عجیب کروفر کے ساتھ جلوہ افروز رہے ۔ میں نے آج تک ایسا جری فاتح کہاں دیکھا تھا۔ میرے دل کا شاید یہی اوّل اور آخر ارمان تھا کہ فرڈی مجھے فتح کرلے فرڈی مجھ پر قابض ہو جائے ۔ مجھے زندگی میں پہلی بار ایسی شکست نصیب ہوئی جس کے لئے شاید کئی بار بے خبری میں میں نے دعائیں کی تھیں اور آج کتنی ہی مسرتوں کے ہجوم میں بڑے ہی فخر کے ساتھ میں نے اس شکست کو قبول کیا تھا۔

فرڈی اتنا جوان تھا کہ میں نہیں سمجھتی دنیا میں کوئی اور مرد اس سے زیادہ جوان ہو سکتا تھا اور ہم دونوں شاید ایک دوسرے کے لئے اس وقت بنے تھے جب خدا نے یہ سوچا ہو گا کہ انسان کو کائنات کی ہر شئے سے زیادہ حسین ہونا چاہیئے ۔ زندگی میں پہلی بار مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا تھا کہ عورت دراصل بنی ہے صرف مرد سے عشق کرنے کے لئے اور تخلیق کائینات ہوئی ہے صرف اس لئے کہ انسان یہی ایک کارجہاں انجام دے اور دل کی وہ حسرت نکال لے جس کا دوسرا نام زندگی ہے ۔

فرڈی جب میری زندگی میں جلوہ گر ہوا تو میرا یہ یقین اور مستحکم ہو گیا کہ قدرت نے مجھے بنایا ہی تھا زندگی کی ان بلندیوں کے لئے جہاں میں کبھی عشق بھی کروں گی تو صرف اس مرد سے جو دیومالائی دنیاؤں سے بھاگ کر صرف اس لیئے دھرتی کی طرف آجائے گا کہ اس کی زندگی کی پیاس بجھ سکے ۔ میں نازاں و فرحاں یہی سوچتی رہی کہ میں نے وہ عشق کبھی نہیں کیا جو گلی کوچوں میں ہوتا ہے جو نامراد ہو یا بامراد صرف ایک شاعر کا عشق ہوتا ہے، صرف الفاظ ہی الفاظ اور معنی مطلب کچھ نہیں ۔ بڑی ہنسی آئی اس خیال پر جانے کوئی شاعر بیچارہ کیا سوچے ۔

فرڈی رہنے والا تو ہو گا شاہینوں کے دیش کا، لیکن دھرتی پر اس نے فرانس میں کہیں سکونت اختیار کرلی تھی ۔ اس کا پورا نام کچھ دو تین الفاظ سے مل کر بنا تھا مجھے بڑا کٹھن لگتا تھا اس لیئے میں نے ان مشکل الفاظ کو اپنے دل کے تپتے ہوئے جذبات میں پگھلا کر فرڈی

جیسے نام میں ڈھال لیا تھا ۔۔۔ فرڈی دراصل ہیروں کا بیوپاری تھا۔ وہ کئی دیش گھوم کر ہندوستان آیا تھا۔ اُسے یہاں آنا تھا اور اُسی شہر اور اُسی ہوٹل میں آنا تھا جہاں میں اس کی منتظر تھی اور ہیوسن کے اسی سوٹ میں آکر ٹھہرتا تھا جو میرے سوٹ کے بغل میں تھا یہ سب ایک سازش تھی ان حالات کی جو میری زندگی کو اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہے تھے۔

پہلی ہی ملاقات میں جب میں نے اس سے کہا تھا کہ ہیروں کی تجارت کی اسے کیا ضرورت ہے جبکہ وہ خود اپنی جگہ ایک بہت ہی قیمتی ہیرا ہے تو اس کے چہرے سے ایک ایسی روشنی پھوٹ پڑی تھی جیسی کہ طلوعِ آفتاب سے پہلے سارے اُفق پر چھا جاتی ہے ۔۔ جب قدرت کا یہ فیصلہ اٹل ہی تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں تو ہمارے قریب آنے میں دیر کیوں لگتی ۔۔

فرڈی کے ساتھ وہ میری پہلی رات تھی۔ اُس شام میں نے بڑے ہی چاؤ اور لگن سے غسل کیا تھا۔ ہر موئے بدن میرا معطر تھا۔ سنگھار تو جیسے اپنے آپ ہو گیا تھا۔ اس طرح کہ چہرے کا ہر زاویہ سنور کر ایک انجانی طلب کا اظہار بن گیا تھا۔ آج لباس بھی میں نے وہ پہنا تھا جس کی خواہش کرتے ہوئے بادشاہ نے ایک بار کہا تھا

"ایک کالی رات کے اندر ایک سرو قد سحر کھڑی نظر آئے" اور اس میں بھی رات سے زیادہ سحر نمایاں ہو ۔۔"

جب میں نے بڑے ہی فاتحانہ انداز میں فرڈی کے کمرے میں قدم رکھا تو فرڈی نے آگے بڑھ کر میرا سواگت کیا اور جھک کر میرے ہاتھ چوم لئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرا وہ خیال سچا تھا جو جنگلی کے ساتھ اس کے گھر کے ٹیرس پر بیٹھے ہوئے میرے ذہن میں آیا تھا کہ "شائد ایک وقت ایسا بھی آجائے کہ آسمان کے ستارے میری اقلیم میں آکر میرے سامنے سرنگوں ہو جائیں ۔" جب میں اور فرڈی ایک دوسرے کے بالکل قریب ہوئے اور ایک دوسرے کے مقابل آگئے تو مجھے یہی محسوس ہوا کہ ہماری خلوت سے ہو کر شاید

اب وقت بھی نہ گذر سکے۔ یا پھر گذرے بھی تو نظریں جھکائے باادب چپ چاپ —
فرڈی نے جب میری باہیں پکڑ کر مجھے نظر بھر کر دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی
میں پہلی بار مجھے کسی مرد نے چھوا ہے، مجھے سلگایا ہے۔ مجھے یاد نہیں اس نے کیا
باتیں کیں۔ وہ پیتا رہا، پلاتا رہا۔ اس سے پہلے شاید ہی کبھی میں نے اتنی بے معنی
باتیں کی ہوں گی اور شاید ہی کبھی مجھے اتنی بے وجہ ہنسی آئی ہوگی — آخر دھیرے
دھیرے وہ لمحہ آگیا جب کہ میں فرڈی کی سانسوں میں الجھ گئی۔ اس کے سنہرے بال، اس کا
سنہرا چہرہ، اس کے ہونٹوں کی سنہری نمی — اس کے سینے پر پھیلے ہوئے سنہرے بال مجھے
میرے اپنے وجود سے پوری طرح بے خبر کیے ہوئے تھے۔ شراب کی تندی و تیزی نشہ رقص
جذبات کو بار بار مہمیز لگا رہا تھا اور پھر جب فرڈی ایک آگ کا شعلہ بن کر میری طرف لپکا تو میں نے اپنے بدن کی ساری
بے تابیوں کو ایک بدمستانہ انداز میں اس کے بدن میں منتقل کر دیا۔ اس وقت مجھے
یہ یقین ہو گیا کہ اب فرڈی پل بھر میں میرے اس حسین سے لباس کو نوچ پھینکے گا —
لیکن اف رے وہ سیلاب جنوں، مجھ سے اس ایک پل کا بھی انتظار نہ ہو سکا اور تڑپ
کر میں نے خود اپنے ہاتھوں اپنا لباس نوچ پھینکا اور سلگتی ہوئی آواز میں کہا —
"یہ لو فرڈی، یہ وہ روشنی ہے جس سے تمہاری ساری زندگی روشن رہے گی" ایک بجلی
بن کر میں کوند گئی تھی۔

لیکن جانے کیا ہوا۔ اچانک فرڈی کی زبان سے نکلا — "NO —"
اس کی پلکیں جھک گئیں۔ اس نے کہا — "NO — BE SHY —" اس کے چہرے
پر پسینہ آگیا۔ پھر اس نے کہا "NO – NOT THE FULL DRESS —"
اور وہ یکلخت اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے اندر کے کمرے کی طرف بھاگ گیا۔
مجھے میری آنکھوں کی جگہ دو دہکتے انگارے محسوس ہوئے۔ میرے خون کی آگ

میں میرے اندر کچھ جل بھن گیا تھا۔ ایک وحشی کی طرح میں اُسی کمرے کی طرف لپکی اور دروازے کو دھکیل کر آندھی کی طرح اس کمرے میں گھس گئی وہ سر جھکائے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے تپائی پر بیٹھا تھا۔ میں دیوانہ وار اس پر جھپٹ پڑی اور اُس کے گال پر پوری قوت سے ایک طمانچہ مار کر اس کے بال نوچنے لگی۔ وہ پسینے میں شرابور تھا اور چپ تھا۔ مجھے کچھ ہوش آ گیا اس کے بال چھوڑ دیئے اور پلٹ کر اپنی آنکھوں پر میں نے اپنے ہاتھ رکھ لیئے۔ کاش اس وقت دو آنسو نکل پڑتے ــــ فرڈی نے دھیمی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ میں نے پلٹ کر انہی آگ برساتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا فرڈی اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھوں میں اس وقت ہیروں کا ایک ہار تھا۔ جیسے ہی اس نے اس ہار کا کیس میری طرف بڑھایا میرے سینے میں ایک جھکڑ سا اُٹھا اور اس ہار پر میں نے کچھ اس زور سے ایک ہاتھ مارا کہ ہار کے ہیرے فرش پر بکھر گئے اور پھر اُن بکھرے ہوئے ہیروں کو اپنے پاؤں تلے مسل کر میں بے ہوش وحواس کمرے سے بھاگ گئی۔

پھر وہ رات میری ساری زندگی پر چھائی رہی۔ میں یہی سوچتی رہی کہ شائد اس رات کی کبھی سحر نہیں ہوگی۔ دوسرے دن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ فرڈی ایرپورٹ چلا گیا ہے تو میرے سارے ہوش وحواس مجھے ایرپورٹ کی طرف لے بھاگے لیکن مجھے پتہ نہ چل سکا کہ کس جہاز میں بیٹھ کر وہ آسمانوں کی طرف اُڑ گیا تھا۔

ویسے عشق ایک عام جذبہ ہے معمولی سی بات ہے لیکن ہوتا یہ ہے لوہے کی ایک لوکدار تپتی ہوئی سلاخ جیسا جس کی نوک آدمی کے دل کو بار بار داغتی رہتی ہے ــــ پھر اس پر تنہائیاں! یہ تنہائیاں تو آدمی کے جسم کو الگ الگ کئی حصوں میں کاٹ کر رکھ دیتی ہیں ہر طرف سے وار کرنے والی کتنی تیز دھار ہوتی ہے اِن کی۔

میں نے اپنے بدن کے کٹے ہوئے سارے حصوں کو بڑی ہی مشکل سے یکجا کیا اور

سنبھلی سنبھلی سانس لی۔ اپنی بکھری ہوئی نظروں کو ایک نقطے پر مرکوز کرنے کی کوشش کی اور سوچا عشق و شق واہیات سی شئے ہے اور ہے بھی تو ایک دکھ، وہ بھی بڑا ہی عام اور نچلے قسم کا، جس پر ہر ایرا غیرا حق جتاتا ہے اُس کے ساتھ یہ پُر ہول نا اُمیدی، ۔ یہ تو بالکل ایسی قبر ہے جس میں لیٹ کر آدمی اپنے آپ کو خود ہی دفن کر لیتا ہے۔

کیا یہ سچ ہے کہ کبھی اپنے دکھ کے احساس کے ساتھ کوئی اپنا بھی یاد آجاتا ہے پر قبر کے تصوّر کے ساتھ ہی مجھے میری ماں یاد آ گئی جسے میں نے اپنی زندگی کی رنگا رنگ مصروفیتوں میں کہیں کھو دیا تھا ــــ میری ماں مر چکی تھی۔

میں نے بڑی تلخ سی شراب پی۔ پھر کچھ دیر بعد جنگلی کو ٹیلیفون کر دیا۔ جنگلی ٹیلیفون پر نہیں ملا۔ پھر اچانک فریڈی اس طرح یاد آ گیا جیسے سرد ہوا کے جھونکے سے میرا سارا لباس لہرانے لگا ہو ــــ میں نے دو گھونٹ شراب کے اور پیئے اور اپنے سارے ساتھیوں کو یکے بعد دیگرے ٹیلیفون کرنا شروع کر دیا۔ لیکن سب کے ٹیلیفون جیسے پتھر بن گئے تھے۔ پھر آخر میں جانے کیوں کچھ جھجکتے ہوئے سہمے ہوئے میں نے ماشادہ کو ٹیلیفون کیا۔ اُدھر سے ایک مرد کی آواز آئی ــــ میں نے اپنا نام اور پتہ بتایا تو فوراً ٹیلیفون کٹ ہو گیا ــــ دل میں ایک آگ سی بھڑکی۔ میں نے ٹیلیفون رکھ کر شراب کا گلاس اٹھا لیا ــــ پھر ایک ایسا وقفہ گذر گیا جس میں نہ کوئی لمحہ ہوتا ہے، نہ کوئی گھڑی ہوتی ہے نہ کوئی پل ــــ وقت کا کوئی نام نہیں ہوتا۔

اس وقفے کے بعد میرے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ پھر دروازہ کھلا اور کوئی تیز اور نوکدار شئے ٹھیک میرے سینے کے پاس آ کر رک گئی یہ مسیز ر کی ناک تھی۔ اس سے قبل کہ میں اس سے چیخ کر کہتی "چلے جاؤ یہاں سے" اُس نے بڑی ہی پُرسکون آواز میں مجھ سے کہا ــــ "صاحب نے بُلایا ہے" میں نے اُسے بڑی ہی چمکدار نظروں سے دیکھا۔ اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

اب میں پھر اسی لمبی چوڑی قیمتی کار میں بیٹھی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ شہر کی وہی بڑی بڑی سڑکیں۔ وہی سرخ سبز نیلی اور دوسری روشنیاں۔ وہی سرد ہواؤں کے جھونکے۔ سیزر کا وہی بھک سفید لباس، مجھے اپنے اونچے مقام کا احساس دلاتا ہوا۔ اس کی وہی پولیس افسروں کی سی ٹوپی۔ اسٹیرنگ پر وہی اس کے بھرے بھرے ہاتھ، کار اسی زور و شور کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں کار شاہراہوں کو چھوڑ کر گلیوں کے چکر کاٹنے لگی اور اس سے قبل کہ میں کچھ سمجھ سکتی کار ایک تنگ گلی میں ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے آ کر رک گئی بڑی ہی پھرتی سے سیزر کار سے اتر پڑا اور میری سیٹ کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا اور بڑے ہی ادب سے بولا ــــ "اُتر جائیے"۔

میں نے پوچھا ــــ "یہاں کیوں"؟

"آپ کو یہیں اُترنا ہے۔ جلدی سے اُتر جائیے ورنہ گلی کے لوگ جمع ہو جائیں گے"۔

میں نے غصہ میں کہا ــــ "میں یہاں نہیں اتروں گی ــ" اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میری کلائی پکڑی اور اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا ــــ "ضد نہ کیجئے، اُتر جائیے۔" اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت نے مجھے اُترنے پر مجبور کر دیا۔ میں جب اس چھوٹے سے گھر میں داخل ہوئی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنی قبر میں قدم رکھ رہی ہوں ــــ سیزر نے ایک مدھم سی روشنی جلائی ایک چھوٹے سے کمرے میں دو تین کرسیاں تھیں اور ایک کونے میں ایک چھوٹا سا صاف ستھرا بستر تھا۔ میں نے پلٹ کر سیزر سے بہت ہی غصے میں پوچھا۔

"تم مجھے یہاں کیوں لے آئے ہو؟" اس نے کہا۔

"آپ کو اب یہیں رہنا ہے" میں نے کہا

"میں یہاں نہیں رہوں گی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے دروازے کا رُخ کیا لیکن سیزر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی ــــ میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی

کوشش کی۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیئے اور مجھے زور سے اس بستر پر ڈھکیل دیا۔ میں نے چیخ کر اسے گالی دی ۔۔۔ "کتیا کی اولاد ۔۔۔"

اس نے میرے قریب آتے ہوئے کہا ۔۔۔" کتیا کی اولاد میں نہیں ہوں کتیا تم ہو۔ شہر بھر کے کتوں کی ٹانگوں میں رہنے والی ۔۔۔"

میں تلملا کر بے قابو ہو گئی اور اس پر جھپٹ پڑی۔ اس وقت سیزر نے کچھ اتنی زور سے ایک لات میری کمر پہ ماری کر تڑپ کر میں پلنگ پہ گر پڑی اور میری کمر ایسی بیٹھ گئی کہ میں پھر وہاں سے اٹھ نہیں سکی ۔۔۔ دو گھڑی بعد میں نے اپنی بھری ہوئی لیکن مجبور نظروں سے سیزر کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے شرمسار آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور دبی دبی آواز میں کہا۔

"مجھے معاف کر دو۔ تمہارے لیئے اب یہی ایک مقام رہ گیا ہے یہ میرا گھر ہے میں بہت اچھا آدمی ہوں۔ تمہاری مرضی کے خلاف یہاں کوئی بات نہیں ہوگی۔"

تھوڑے سے ہی دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ دراصل مجھے کوئی روگ لگ گیا ہے اچانک مجھے ایک انجانی سی خوشی ہوئی جو شاید ہی کبھی کسی کو نصیب ہوتی ہو۔ بار بار یہ خوشی میرے خون میں تیزی سے سرایت کرتی ہوئی میرے دل و دماغ سے ٹکرا جاتی ۔۔۔

" فرڈی بچ گیا ۔۔۔ فرڈی بچ گیا ۔۔۔"

میں ان دنوں یوں تو چپ چاپ سی تھی لیکن اندر ہی اندر جی کھول کر ہنستی ہوئی رہتی" اندر ہی اندر چیختی چلاتی رہتی کہ فرڈی بچ گیا ۔۔۔ فرڈی بچ گیا ۔۔۔ اس بات پہ میں کتنی مسرور تھی کہ فرڈی کے پاس میری لاج رہ گئی۔ اپنے جی جان سے میں ان حالات کی مشکور و ممنون ہوں جن کے باعث فرڈی مجھ سے بچھڑ گیا اور مجھے اس سے عشق ہو گیا

وہ پہلی رات جو فرڈی کے ساتھ گذری تھی اور جس کے بارے میں میں نے سوچا تھا کہ شاید اس کی سحر کبھی نہیں ہوگی آج اس کی سحر ہونے والی ہے۔ میں سمجھتی ہوں جس رات

کی سحر ہوتی ہے وہ رات سہاگن بن جاتی ہے۔

یہ ہسپتال کا ایک وارڈ ہے جب سے میں ہسپتال میں شریک کی گئی ہوں میں نے یہ کہانی لکھنا شروع کر دی تھی آج اس کہانی کو مکمل کر رہی ہوں ــــ صبح میرا آپریشن ہونے والا ہے ــــ دنیا بھر کی دوائیں دیکر مجھے آپریشن کے لیئے تیار کر دیا گیا ہے۔ ڈیوٹی نرس بہت ہی اچھی عورت ہے۔ میری دوست بن گئی ہے ــــ اول شب ہی وہ ایک خواب آور دوا کا انجکشن لے آئی تھی کہ مجھے رات بھر میٹھی نیند سلا دے تاکہ صبح میں آپریشن کا مقابلہ کر سکوں۔ اس لیئے بھی کہ یہ کوئی بڑا آپریشن ہے۔ لیکن میری التجا پر اس نے مجھے اتنا وقت دے دیا کہ میں یہ کہانی مکمل کر لوں ــــ مدھم سی روشنی ہے۔ رات کی خاموشی وارڈ کے باہر دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اس لیئے بھی بڑے ہی سکون سے میں نے یہ سب کچھ لکھا ہے اور یہ سب کچھ لکھ دینے کے بعد مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اپنی زندگی کا پہلا اور آخری فرض میں نے ادا کر دیا ہے۔ عجیب سا سکون ہے آپریشن کامیاب ہو یا ناکام مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں' اس لیئے بھی کہ اس بات پر میں آج اپنے آپ کو بہت مطمئن، شاداں اور پُر سکون پاتی ہوں کہ زمانے نے مجھے اس زندگی سے بچا لیا جو اپنی گھناؤنی اور سڑاند سے بھرپور تاریک گلیوں میں اپنے دکھوں کے کوڑا کرکٹ میں پڑی سڑتی رہتی اور جیسے موت اپنی کالی زبان سے ہر پل چاٹتی رہتی ہے۔

میں نے وہی زندگی گذاری جس کے لیئے میں پیدا ہوئی تھی ــــ میں اپنے اس احساس پر نازاں ہوں کہ میرا تعلق ایک اونچے خاندان سے رہا تھا۔ اُسی احساس نے مجھے زندگی کی بلندیوں پر پہونچا دیا تھا ــــ اور آج انہی بلندیوں نے میرے لئے وہ مزار بنا دیا ہے جس میں کل میں مردہ رہوں یا زندہ میرے لیئے کوئی فرق نہیں ــــ میں خوش ہوں۔

موت کی آغوش میں اتنی مطمئن زندگی کسے نصیب ہوتی ہے؟

▲

مُصنف کی دیگر تصنیفات،

مشاہیر کی رائے میں

(ناول بڑا آدمی ۔ تاثرات)

پروفیسر قمر رئیس

آپ کے ناول بڑا آدمی کا بغور مطالعہ کیا۔ سیدھے سادے شفاف بیانیہ میں بڑی کشش اور پکڑ محسوس کی۔ میرا دل خوشی سے جھوم اُٹھا کہ اردو میں بھی آخر ایک ایسا ناول لکھا گیا جس کا مقابلہ ترقی یافتہ زبانوں کے ناولوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ناول میں عنفوانِ شباب کے جنسی ولولوں، آرزومندیوں، خوابوں اور ہیجان انگیز محرکوں کا بیان اتنا خوبصورت اور POWERFUL ہے کہ مجھے لگا اردو کا کوئی دوسرا ناول اس بلندی تک نہیں پہونچ سکا۔ میرا خیال تھا راوی جلد ہی عہدِ رنگیں کی سرحد عبور کرے گا تو اس کے کردار میں پختگی آجائے گی۔ ناول میں سیاسی واقعات اور تہذیبی زوال اور بکھراؤ کی طرف اشارے ضرور ہیں اور بعض بہت بلیغ بھی، لیکن صرف اشارے۔ مخدوم کے انقلابی کردار کی بھی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔

میرا پہلا تاثر یہی ہے کہ اس APPROACH کی وجہ سے یہ ناول جس میں ایک بڑا ناول بننے کے سارے امکانات ہیں، بڑا ناول نہیں بن پاتا۔ لیکن اردو زبان کا ایک اہم ناول ضرور کہا جائے گا۔

آپ کا TALENT، آپکی تخلیقیت، گہری دردمندی، انسانی نفسیات کی معرفت اور تخلیقی اظہار پر حاکمانہ قدرت ایسے اوصاف ہیں جو آپ کے ناول کو بہت اہم

بناد یتے ہیں۔

جس طرح فلابیئر، ڈی ایچ لارنس اور ایمیل زولا نے بعض ناولوں میں اپنے کرداروں کی جنسی زندگی اور نفسیات کو معروضیت اور باریکی سے دکھایا ہے۔ اُس زاویۂ نظر سے میں نے ابھی ناول کے بارے میں نہیں سوچا ہے۔ اس ناول کی نئی ساخت میں ڈرامائیت یا ڈرامائی عناصر غالب ہیں۔ ہر بات ایسا لگتا ہے آپ کے بیانیے کی قوت سے اسٹیج ڈرامہ کا ایک منظر بن گیا ہے اور ہر منظر اپنے آپ میں بے حد موثر اور جاندار ہے۔ اس لئے کہ اس میں انسانی نفسیات خصوصاً جنسی نفسیات کے نت نئے پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔

دانشورانہ سطح پر بھی اِس ناول کی پہچان اور اہمیت الگ ہے۔ کہیں کہیں PARADOXICAL طرزِ بیان فکر انگیز بن جاتا ہے اور نا دیدہ سچائیوں پر سے پردا اُٹھاتا ہے اور زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے میں مدد کرتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے اس ناول پر ایک بھر پور تبصرہ لکھوں۔ صحت ٹھیک رہی تو آئندہ چند مہینوں میں یہ کام ضرور کروں گا۔

آپ کو آپ کی اِس خوبصورت تخلیق پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(خط سے اقتباس)

راج بہادر گوڑ

میں نے محسن علی کا ناول "بڑا آدمی" پڑھا تو چونک سا گیا۔ یہ کسی بڑے ہیرو کے اطراف گھومنے والا ناول نہیں، نہ کوئی مربوط کہانی ہے اور نہ پلاٹ۔ مگر کہانی اور پلاٹ کی ایک زیریں رو ضرور ملتی ہے جو پورے ناول کو اپنے تانے بانے میں جکڑے رکھتی ہے اور اسے ایک منزل عطا کرتی ہے۔ جیسے مصنف نے خود اشارہ کیا ہے۔ متعدد کردار ملیں گے جو جگنوؤں کی طرح منظر پر آتے ہیں

اُن کی چمک ہی اُن کے بڑے پن کی علامت ہے جو ان سب جگنوؤں میں چھپا ہوا ہے یہی تو وہ بڑے آدمی ہیں جو بڑے نظر نہیں آتے۔ اور ان سے دُنیا بھری پڑی ہے بڑے آدمی کم ہیں لیکن نامعلوم بڑے متعدد ہیں۔ انہی نامعلوم" گمنام بڑوں پر سے محسن علی پردا اُٹھاتے ہیں۔

پروفیسر جعفر نظام

محسن علی انسان کی بلند کرداری ہی کو اس کی عظمت مانتے ہیں۔ وہ قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ عظیم سے عظیم انسان کے کردار کی بنیاد صرف جذبۂ عشق نہیں ہوتا بلکہ ہر وہ جذبہ ہوتا ہے جو انسان کے وجود کا تحفظ اور وقار بنتا ہے۔ یہ ناول صرف داستانِ عشق نہیں ہے۔ یہ انسان کے فطری تقاضوں اور ان کے زیر اثر اس کے رویوں سے بننے بگڑنے والی زندگی کی داستان ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں ——

"فوقیتِ انسان اور ذلتِ انسان کے امتزاج کے جیتے جاگتے تصوّر کو تہذیب کا نام دینا ہی خود پسند اور خود بین طبقات کی فوقیت کا آسان ترین ذریعہ ہے اور اُنکے کردار کی گراوٹ کی پردہ پوشی ہمیشہ تہذیب کے اسی تصوّر نے کی ہے۔"

یہ ناول کسی بڑے آدمی کی رودادِ حیات نہیں ہے۔ بلکہ یہ کچھ چھوٹے چھوٹے کرداروں کی زندگی کے حالات اور واقعات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول کا کوئی ہیرو ہے نہ کوئی ہیروئین۔ اس طرح یہ ناول عام اور روایتی تصوّر سے یکسر مختلف ہے۔ کچھ انسان ایسی زندگی گذارتے ہیں کہ اُن کے کرداروں میں بھی کچھ ایسے روشن پہلو ہوتے ہیں جو ایک سچے اور عظیم جذبہ کی صداقت کو تقویت پہنچاتے رہتے ہیں اور جن کے بل پر وہ اپنی زندگی کی ہی نہیں بلکہ اپنے اُس جذبے کی عظمت اور صداقت کی حفاظت کرتے ہیں اور ہر قیمت پر اس کو زندہ رکھتے ہیں۔

محسن علی کا یہ ناول انسانی فطرت کا ایک وسیع تناظر

WIDE —
PERSPECTIVE

پیش کرتا ہے۔ میری رائے میں محسن علی کا یہ ناول ایک بہت ہی قابلِ قدر تخلیق ہے

ناصر بغدادی (نامور ادیب اور چیف ایڈیٹر سہ ماہی "بادبان" کراچی)

" ناول میں معروضی تہہ داری ہے اور کلثوم، فرزی اور ہیرو کے کردار یادگار حیثیت کے حامل ہیں۔ مصنف کا اسلوبِ نگارش اس کا اپنا ہے اس لیئے انفرادیت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔"

میر ھاشم (نامور شاعر اور THE FRIGRANCE OF THE BOOK کے مصنف)

محسن علی کے ناول "بڑا آدمی" کے تعلق سے۔ زبان و بیان پر مصنف کی قدرت حیرت انگیز ہے اور ہر سچویشن اس کی گرفت میں ہے۔ کہانی رواں دواں ہے۔ پلاٹ ترسیل کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا "انسان کی شہرت و ناموری کوئی قوت نہیں ہوتی۔ یہ تو وہ سہارے ہیں جو نادار و نادان بے کس و مجبور انسانوں کے ہجوم کے کمزور شانوں سے ملتے ہیں۔ ورنہ سچی عظمت و بلندی تو وہ ہوتی ہے جہاں پہنچنے والا اپنی جگہ اکیلا ہوتا ہے، تن تنہا اور زمین کے لمس کو کھو کر اس بلندی کا درد سہتا رہتا ہے۔۔۔۔" یہ الفاظ مصنف کی فکر کی گہرائی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔"

محسن علی کی انگریزی تصنیف ۔ The gold

پروفیسر شیو کے کمار (انگلش کے نامور شاعر، ادیب و محقق)

" محسن علی کی انگریزی تصنیف The gold گو شعری تخلیق نہیں ہے۔ لیکن اس کی نثر میں بھی شاعری کا رنگ و آہنگ ہے۔ اس کا ہر اظہار شعری قالب میں ڈھلا لگتا ہے۔ اس فکری تخلیق میں جو مقولے ہیں ان میں سقراط کی فہم د

فراست کی چمک دمک ملتی ہے۔ جو بات بھی کہی گئی ہے وہ بڑی ہی پُر مغز پُر لطف اور بصیرت افروز ہے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

پروفیسر پیس کے ورما (وائس چانسلر انسٹیٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لنگو یجیس)

محسن کی انگلش تصنیف THE GOLD اُس کی اس فکر اور اُس کے اُن تصورات حیات کا اظہار ہے جو اُس کے اطراف پھیلی ہوئی اس کائینات نے اس کی حساس شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہوئے اُس کو ودیعت کیئے ہیں یہ ایسے تصورات ہیں جو اپنی مخصوص آب وتاب کے ساتھ محسن کے دماغ کو روشن کرتے رہے ہیں جس کو وہ بڑے ہی پُر مغز و پُر معنیٰ الفاظ میں ڈھالتا رہا ہے محسن کے ہر ایسے اظہار میں ایک عجیب فن ہے جو آپ کے فہم وخیال کو تیزی سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور ساتھ ہی پیرائے اظہار ایسا ہمہ گیر ہے کہ انسانی فطرت اور معاشرے کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کے عمل کا واضح تجزیہ پیش کرتا ہے۔ محسن کی یہ پیش کش اصل میں (۶۸۰) موتیوں کی ایک لڑی ہے جس کا ہر موتی اپنی چمک دمک رکھتا ہے اور اپنے حسن ضیاپاشی سے اُس لڑی کی زرداری اور قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ محسن کی اس تصنیف THE GOLD میں قاری کو فہم وفراست کا ایک خزانہ مل جاتا ہے اور یہ کتاب اپنے نام کی مناسبت سے حقیقی معنوں میں GOLD MINE کہلانے کی مستحق ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

پروفیسر جعفر نظام وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی۔

محسن علی کی انگریزی تصنیف THE GOLD میں جتنے مقولے شامل ہیں وہ سب انکی اپنی تخلیق ہیں جو بہت ہی فکر انگیز اور روایت پرستی سے واضح انحراف

ہیں اور ساتھ ہی اُن کی ذہانت کی ایک مخصوص لطافت اور ایک زود اثر مزاح کا انداز لیتے ہوئے ہیں۔ اِس تصنیف کا قاری اس معمورۂ فکر و احساس سے گذر کر اپنے آپکو بہت ہی مطمئن اور مسرور پائے گا اور مصنف سے ایک اور ایسی ہی تصنیف کا متمنی ہوگا۔

محسن علی بڑی ہی گہری حسیت اور ایک ہمہ گیر بصیرت سے مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اُن حقائق کا جن میں ایک سچ کی گرفت اور سچی ارضیت ہوتی ہے۔

ڈی' ستیارام (مشہور فری لانس جرنلسٹ)

لگتا ہے محسن علی کو قدرت نے ایک عجیب صلاحیت ودیعت کی ہے اپنی بات کو بہت ہی پُر لطف اور پُر اثر بنا کر کہنے کی۔ محسن علی جو گوناں گوں صلاحیتوں کے مالک لگتے ہیں اپنے انداز مزاح میں اپنا ایک رنگ رکھتے ہیں THE GOLD کا مطالعہ نہ صرف ایک پُر لطف ذہنی سفر ہوگا بلکہ آپ محسن کی فکر اور خیالات کی گرفت میں آجائینگے بلکہ آسانی سے اُن میں کھو جائینگے۔ ایسی کئی باتیں ہیں جن کو پڑھ کر آپ ایک بڑی ہی حیرت انگیز کیفیت سے دوچار ہو جائیں گے۔

بی - ین - رامن (سابق چیف سکریٹری اور نامور اسکالر)

میں یقیناً یہ چاہتا ہوں کہ محسن علی کی یہ انگریزی تصنیف THE GOLD کا ہر شخص مطالعہ کرے، خصوصاً ایسے حضرات جو اکثر کسی مختصر لیکن جامع اظہار میں عقل و فراست کے نکات کی تلاش کرتے ہیں جو انسانی ذہانت کا ایک دلفریب نشان بنتے ہیں۔ جیسے ایک تلخ سچ ایک مزاح لطیف بنتا ہے۔ ایسے حضرات کے لئے قدیم صحیفوں میں ایسے نکات کی تلاش کرنے کے بجائے زیادہ مناسب ہے کہ وہ THE GOLD کے مصنف کی ان خوش خیالیوں میں شریک ہو جائیں اور حق گوئی کی وہی لذت محسوس کریں جو اِس کتاب کے تخلیق کارنے کی ہے

(انگریزی سے ترجمہ)

ادب ــ ایک زاویہ نگاہ

عام فہم اظہار : ــ کمالِ فن ــ کمالِ ادب

ملک کے اہم شہروں میں اہم ادبی مراکز اور ادب کے دیگر اہم گوشوں میں، ساتھ ہی بہت سے اہم اور بڑے بڑے ادبی رسائل میں اِن دنوں پھر جو بہت ہی گرما گرم اور فکر انگیز مباحث ہو رہے ہیں اُن سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ آج پھر یہ سوال اُٹھائے جا رہے ہیں کہ آج کے دور میں ادب کا صحیح منصب کیا ہونا چاہیئے اور ایک ادیب، شاعر یا نقاد کے فرائض کیا ہونے چاہئیں۔ اس کوشش کے بنیادی اسباب شاید یہ مفروضات ہیں کہ آج کا ادیب یا شاعر اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر رہا ہے اور آج کا ادب زندگی کے تقاضوں سے غفلت برت رہا ہے۔ یہ مفروضات یا دفن کے تقاضے اپنی جگہ لیکن ذہن میں اُٹھنے والے اس سوال کا جواب ملنا مشکل لگتا ہے کہ ان موضوعات پر ان کے تعلق سے ہونے والی نظریاتی کشمکشوں پر گزشتہ نصف صدی میں دفتر کے دفتر سیاہ ہو گئے۔ انسانی فکر و تخلیق کے سمندروں میں اُٹھنے والے طوفانوں نے تو مشرق سے لے کر مغرب تک بہت کچھ اتھل پتھل کر کے رکھ دیا۔ پھر آج یہ ضرورت کیوں پیش آرہی ہے جب کہ آج کے انسان کا شعور زیادہ ماضی پسند رہا ہے نہ ماضی سے مرعوب ــ اور نئی نسلوں کی نظر آج اپنے ماضی سے زیادہ اپنے مستقبل پر ہے

اور تصوّراتی علم اور فلسفیانہ نظریات کی بے اثری کے سبب اب وہ زندگی اور معاشرے کے ایک نئے تصوّر کی نئی سمتوں کی کھوج میں ہیں۔ شعوری نہیں تو یہ کھوج آج لاشعوری ضرور ہے اور زندگی کے ان بدلتے تصوّرات یا بدلتے معنوں کے ساتھ ایک نئی زندگی کا جو تصوّر جنم لے رہا ہے اس کے لئے اگر ادب جیسے وسیلۂ اظہار کی ضرورت کل باقی رہے تو ادب کا تصور بھی بدل جائے گا۔

ترقی پسند ادب نہ صرف ایک مخصوص نظامِ حیات کے قیام کا آرزومند تھا بلکہ اُس کے لئے کوشاں بھی تھا کمیونزم یا سوشلزم جیسے نظام کے لئے۔ لیکن آج کے دور میں تاریخی حقائق کی روشنی میں اور ایک شعورِ تازہ کے تقاضوں کے اعتبار سے محسوس ہوتا ہے کہ ہم کو آج کسی مخصوص سیاسی یا معاشی نظامِ حیات کی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ کامیاب معاشرہ کسی مخصوص فکر پر مبنی نظامِ حیات سے نہیں بنتا۔ یوں بھی ہر معاشرے کا تاریخی پس منظر جدا ہوتا ہے۔ کسی بھی معاشرے کی پہچان تو اُس میں بسنے والے عوام کی مسرتیں، اُن کی محرومیاں، اُن کی خوش حالی اُن کی پریشان حالی اور اُن کے دُکھ ہوتے ہیں۔ دراصل عوام کی زندگی ہی معاشرہ ہوتی ہے۔ عوام کی ساری ضرورتیں پوری ہوں اور اُن کے دکھوں کا علاج میسر ہو تو وہی معاشرہ اور اُس کا قانون اور اُس کا نظامِ حیات سب سے زیادہ کامیاب ہو گا۔

یہاں میں عرض کروں گا کہ وہ ادب جو عام انسان کی بات کرتا ہے اور عام انسان سے بات کرتا ہے اُس کو عام طور پر مارکسی جانا گیا۔ حالانکہ وہ ادب جس کو مارکسی کہا گیا یعنی ہمارے پاس ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر جو تخلیق ہوا۔ اُس میں مشکل سے مارکس کے نظریات کی روشنی ملتی ہے اور بعض ایسی تخلیقات جن میں مارکسی نظریات کی تلقین بھی ملتی ہے اور اُس کی گرفت بھی محسوس ہوتی ہے، وہ اپنے CONTENT میں علمیت کی رہبری کا انداز رکھتی ہیں لیکن تخلیقی فکر کی باگ کو اپنی طرف موڑ لینے کا

اُن میں یارہ نہیں ہوتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تخلیقی فن کار کی وہی تخلیق سب سے زیادہ پُر اثر اور جاندار ہو سکتی ہے جو ایک احساس کی صداقت کو پیش کرتی ہے اور ہوا بھی ایسا ہی کہ ایسی تخلیقات (فکشن ہو یا شعر) جو فن کار کے سچے احساس و شعورِ حیات کی تخلیقات تھیں وہ اونچے درجہ کا قابل قدر ادب بن گئیں۔ لیکن اس ڈگر سے کوئی فن کار دو قدم بھی ہٹ گیا تو وہ میکانکی ہو گیا ویسے ہر شخص اپنی جگہ آزاد ہے کہ جس طرح چاہے، جس جگہ چاہے اور جس وقت چاہے اور جو چاہے کہہ لے۔ اس عمل سے اُس کو جو کچھ ملتا ہے اُس کا وہ پوری طرح حقدار بھی ہے اور ذمہ دار بھی۔ آزادیٔ اظہار کا حق قانون میں محفوظ ہے۔ اظہار خواہ سچ ہو یا جھوٹ مشہور ہی ہے۔

"FREEDOM OF EXPRESSION BROUGHT ALLTHE SENSE TO HUMAN LIFE, BUT NONSENSE AS WELL"

زندگی صرف فلسفوں اور قانون سے نہیں بنتی بلکہ معاشرے میں پائی جانے والی زندگی کی حاجتوں کی تکمیل سے بنتی ہے اور اسی لیئے انسانی تاریخ یا تہذیب اپنی کسی بھی کامیابی پر سُرخرو نہیں ہو سکی۔

"SOCIETY IS RUN BY ITS NEEDS, NOT BY ITS PRINCIPLES"

جذبۂ بقا کے زیرِ اثر انسان کی فطری رغبتوں نے اُسے جو شعور دیا ہے اُس نے اُس کے انفرادی فکر و عمل کی سمتیں بھی مقرر کی ہیں اور انہی فکری سمتوں نے مختلف منازلِ حیات کی نشاندہی کی ہے۔ بے شمار فلسفے اور مکاتیبِ خیال انسان کے سامنے آتے رہے اور انسان نے اُن سے اپنی فطری رغبتوں کے لحاظ سے چن میں اُس کا علم و شعور بھی شامل رہا۔ کشید کیئے ہوئے مختلف اعتقادات کی تشکیل کی۔ انسان اور کائنات کے وجود کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے بقائے انسان

کے لیئے بے شمار راہیں نکالیں۔ انسان کا کوئی خیال یا عمل، اُس کی کوئی فکر کوئی جذبہ با معنی یا معتبر ہو ہی نہیں سکتا جس کا بنیادی تعلق زندگی کے تعمیری شعور سے نہیں ہوتا اور عملاً اور نتیجتاً وہ اِس طرح ثابت نہیں ہوتا اور اِس حقیقت کو شاید اُس وقت تک جھٹلایا نہیں جا سکتا جب تک کہ انسان انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی آسودہ نہیں ہو جاتا۔

آغازِ تہذیب سے انسانی معاشرے کے فطری ارتقائی عمل میں جو قوتیں اُبھرتی رہی ہیں اُن کا عمل اور ردِ عمل اصل میں ایک ہی نہج پر قائم و دائم رہا۔ اور عوام کی شعوری اور غیر شعوری کشمکش کے زیرِ اثر ظہور پذیر ہونے والی اجتماعی زندگی کی شکلیں اُس کی اپنی اصلیتوں میں کبھی کسی مخصوص فکری یا سیاسی نظام کے تسلط سے زیادہ متاثر نہیں رہیں اور نہ کسی زمانے میں عوام کی زندگی کے مزاج کو کبھی کسی مخصوص فکر یا علمی نظام نے مرتب کیا۔ یہ ایک جھوٹا تصور ہے ورنہ وہ نظام جس کا حکمِ اول اور حکمِ آخر صرف اور صرف ایک عام انسان کی زندگی کے سکون و راحت کا ضامن ہوتا، آج ایک کامیاب نظام بن کر عملی طور پر ظاہر و ثابت شکل میں قائم ہو چکتا۔ لیکن آج تک جتنے بھی نظام ہائے حیات وجود میں آئے۔ وہ سب طبقاتی برتری اور کمتری کے شکار ہو گئے۔ جس کا بنیادی سبب انسان کی فطرت میں ازل ہی سے پایا جانے والا وہ عنصر تھا جو سب سے زیادہ جاندار تھا جس کی بناء پر ہر صاحبِ اقتدار فرد یا طبقے نے ہر نظام کی بنیادی شکل کو اپنی ساری شعوری کوششوں کے ساتھ اس طرح مسخ کر دیا اور اُس کو ایک ایسی شکل میں ڈھال لیا جو اولاً اُس کی اپنی بقاء اور مکمل تحفظ کی ضامن ہو اور ساتھ ہی استحکام اقتدار کے لئے زیادہ سے زیادہ وسائل فراہم کرے۔ یہ تو کل کی تاریخ تھی لیکن آج جب ہم ہمارے روشن ترین دور پر نظر ڈالتے ہیں تو بات سامنے آتی ہے کہ مارکسزم اور کمیونزم جیسی تحریکیں جو

معاشرے میں ہونے والے استحصال و ظلم کی موت بن کر اٹھی تھیں وہ بھی تدریج اسی ذہنیت کا شکار ہو گئیں۔ وہ قوتیں جو ایک غیر طبقاتی نظام کے قیام کا ادعا بن کر سامنے آئی تھیں، ان کو بھی طبقاتی استحصال کا وسیلہ بنا لیا گیا۔ روس، جرمنی، پولینڈ اور رومانیہ وغیرہ میں جو کچھ ہوا وہ اب تاریخ بن چکا ہے۔ چین میں اول اول مارکسزم کا جو تصور تھا وہ وہاں کی معاشرت، تاریخی پس منظر اور وہاں کے عوام کے مزاج سے کبھی قریب نہیں ہو پایا تھا۔ وہاں ماؤ نے اس کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ اس کے بعد کے حالات نے اس کو آج کے اس تصور تک پہنچا دیا تھا جہاں وہ تینانامن چوک پر عوام کے قتل کی شکل بھی بن گیا تھا اور آج تو وہ مارکس کے کچھ نظریات کا ایک DIPLOMATIC STRUETURE بن کر رہ گیا ہے جس میں شاید مارکسزم کے لئے کوئی روم خالی نہیں ہے۔ اس تناظر میں یہ سوچنا زیادہ صحیح نہیں لگتا کہ بجائے خود مارکسزم ناکام ہوا ہے۔

مارکس کی تاریخی بصیرت نے دوسرے سارے تصوراتِ حیات پر ترجیح دی تھی، بقائے حیات کی جدوجہد کو جس میں صرف ارفیت تھی اس میں زمینی زندگی کے سارے سنگلاخ حقائق تھے۔ مارکس کی فکر جن جن تصورات کو ایک واضح شکل میں پیش کرتی ہے وہ سائنسی فارمولوں کی طرح مکمل ہیں یہ ایک ایسا نظریۂ حیات ہے جس میں تصوراتی معنی آفرینی کی گنجائش نہیں اور جس میں ایک ٹھوس اور واضح فکر اپنی پوری معنی خیزی کے ساتھ اپنی مصدقہ و مستحکم دلائل کی قائم کی ہوئی ایک حد بندی قبول کرتی ہے اور ایک قطعیت کی حامل ہے

"WITH MARXISM, PHILOSOPHY SHIFTED TO THE ZONE OF SCIENCE, LOCK, STOCKANDBARREL AND WAS POISED TO SUPER SEDE ALL THE PHAZEZ OF SCIENCE, BECAUSE OF THE MOST CALCULATED HUMAN TOUCH FOUND IN IT."

دیانت فکر اور عقل و آگہی کی روشنی میں دیکھیں تو یقین ہوتا ہے کہ انسانی معاشرے

میں جتنے بھی نظام آئے ہیں اُن میں سے کوئی نظام بھی انسان کی استحقالی ذہنیت سے محفوظ نہیں رہا۔ انسانی فطرت تو بار بار یہ بات یاد دلاتی ہے کہ تہذیب نے تو بڑا اصل ایک ہی نظام قائم کیا تھا جس کے اسمائے گرامی جدا جدا ہو گئے۔

سوچنا یہ ہے کہ ہم اس استحصال کے جبر سے انسان کے کتنے عقیدوں کو محفوظ کر پائے۔ چونکہ ہمارا موضوع ادب ہے۔ یہاں یہ سوچنا ضروری ہے کہ کسی مخصوص فکر سے ادب کو کیوں بندھا رہنا چاہیئے۔ ویسے مارکسزم اپنے اصلی روپ میں انسانیت ہی کی تلاش و جستجو ہے اس لحاظ سے بھی ادب و فنون مارکسزم سے کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی طرح اثر قبول کرتے رہے ہیں۔

مارکس کے دو مشہور زمانہ ہم عصر ٹالسٹائی اور کارلائل بھی مارکسزم کا اثر اس طرح قبول کیئے ہوئے ملتے ہیں کہ ٹالسٹائی کے عظیم ناول WAR & PEACE کی تخلیق کے دوران اس کی نظر میں وہی روسی انقلاب تھا جبکہ پوری روسی قوم نپولین کے خلاف جنگ پر آمادہ ہو گئی تھی (۱۸۱۲ء)۔ اس میں شک نہیں اس میں روحانی تصوّرات بھی اپنا اثر رکھتے تھے چنانچہ کارلائل بھی مارکس کے نظریات کو کامیاب سمجھتا تھا گو کہ اُس کے پاس معاشرے کی اعلیٰ شخصیتوں یعنی سوسائٹی کے ہیروز پر زیادہ اعتماد تھا۔ پھر بھی مقصد تو عوام کی معاشی و سماجی فلاح و بہبود اور مساوات تھا۔ اشتراکیت کا تصوّر بنیادی طور پر نیا نہیں تھا مساوات کا تصوّر مطلق العنانی سے ہٹ کر ہر دور کے معلنہ سیاسی نظام کا جزو لازمی تھا۔ عملی طور پر وہ کوئی حقیقت نہیں بن سکا، یہ اور بات ہے۔ بدھ مت کی تعلیم سبھی کو کیپل وستو کا راجہ بننے کا حقدار ٹھہراتی تھی۔ لیکن مارکس کے نظریات کے زیر اثر بننے والے معاشرے میں معاشی نجات کا جو تصوّر مارکس نے پیش کیا تھا وہ عقلیت پسندی کا ایسا روپ تھا کہ اُس کا قائل نہ ہونا مشکل تھا اور یہ بھی دیکھا گیا کہ روحانی تصوّرات میں ملنے والا اثر و ان کا تصوّر اپنی معنویت کھونے لگا تھا۔ انقلاب

روس کے بعد تو دنیا کے سارے ممالک اس فکر کے اثر میں آ گئے۔ شہنشاہیت پسند اور سرمایہ دار ممالک بھی۔ اس صدی کے چوتھے یا پانچویں دہے میں امریکہ کا جو لٹریچر سامنے آیا، اس میں وہ کتاب بہت مشہور ہوئی جس کا نام تھا — THE GOD THAT FAILED امریکہ کے شاید مجھے ایسے جید اسکالر نے وہ کتاب لکھی تھی جو مارکسزم سے بے پناہ متاثر رہے تھے اور بعد کو مارکسزم کی لے اثری یا ناکامی کا اعلان کتاب کے اس نام سے کیا تھا۔ میرا مطالعہ بہت کم ہے ورنہ اور اس قسم کی کئی باتیں ہوئی تھیں۔ دوسرے مغربی معاشروں میں تو بات یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ شیکسپیر کے ڈراموں سے اشتراکیت ثابت کی جا چکی تھی۔ ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ PARADISE LOST کو (جس سے اقبال بہت زیادہ متاثر تھے) اشتراکی تخلیق بتایا گیا تھا اور برنارڈ شاہ کا کہنا تھا کہ اشتراکیت کے بنا جمہوریت کا تصوّر بے معنیٰ ہے فرانس کا ایک دوسرا بڑا ہی جان دار اور حق و صداقت کی آواز رکھنے والا فلسفہ ژیاں پال سارتر کا فلسفہ وجودیت بھی مارکسزم سے متاثر تھا۔ اس سلسلے میں کچھ اور بھی باتیں ہیں جو ایسے ہی رجحانات کی نشاندہی کرتی ہیں۔

جرمنی کا مشہور فلسفی کانٹ آزادی کا سب سے بڑا علم بردار تھا یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ یورپ کے رومانی ادب اور آرٹ کو کانٹ کے فلسفے نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ عالم مقاصد کی جستجو اور تلاش جس کا امتیازی رجحان تھا۔ یہ بات ادب اور شاعری میں WORDSWORTHIAN-THEORTY کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے کہ شاعری کے لئے عام بول چال کی زبان زیادہ موزوں ہوتی ہے۔ اس صدی کے ایک موڈرن شاعر فراسٹ نے اسی نظریے کی توسیع کر کے اپنی شاعری کے آہنگ اور ڈکشن کے لئے موزوں تصور کیا تھا ایک دوسرے موڈرن شاعر SPENDER کی بہترین تخلیقات میں اسی عام زبان کی سادگی اور آہنگ بان ملتی ہے۔

SPENDER IN HIS BEST WORKS SPEAKS SIMPLICITY AND DIGNITY
گو کہ موڈرن شاعروں کے تعلق سے ایک رائے عام تھی کہ اُس میں
INTELLECT DOMINATES FEELINGS —

۲۔ فن کے اظہار میں عوام کی اہمیت بھی عجیب تھی۔
جرمنی کے مشہور و معروف ایک برتر قسم کے موسیقار لڈوک بیتھوون نے اُس کی
اپنی ایک عظیم تخلیق کا IROICA BONAPARTE SYMPHONY کا نام دیا تھا۔
اس یقین کے ساتھ کہ نپولین اعظم عوام کا سپاہی
ہے لیکن جب نپولین نے شہنشاہی کا تاج پہن لیا تو بیتھوون نے اپنے اس عظیم
کارنامے کا نام بدل کر پھر اس کا اصلی نام ERoICA ہی رکھ دیا اور نپولین کا نام نکال
دیا۔ بیتھوون ۱۷۷۰ء میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔
فن کا کتنا گہرا تعلق ہے غریب عوام کی زندگی سے۔ فن کا سچا تاثر تو انہی
احساسات و جذبات کے اظہار میں ملتا ہے جو زندگی کی گوناگوں محرومیوں کی تخلیق
ہوتے ہیں۔ گو کہ فن تو زندگی کے ہر رخ کا عکس بنتا ہے لیکن جب فن عوام کی غم و الم
سے بھری زندگی کا عکس بنتا ہے تو اُس کے تاثر کے چراغ اور روشن ہو جاتے ہیں
اور اُن کی روشنی معاشرے کی رہنمائی کرتی ہے۔
ایک وقت کی ایک امیر کبیر شخصیت ایک لارڈ جس کو فن مصوری سے لگاؤ تھا
اپنی ایک تخلیق مشہور زمانہ مصور و مجسمہ ساز گریٹ ٹرنر کے پاس لے گئے۔ ٹرنر
نے اُس فن پارے کو بغور دیکھا اور قدر کی نظر سے دیکھا اور پھر گویا ہوا۔
"MY LORDS YOU LACK NOTHING BUT POVERTY TO BECOME AN EXCELLENT PAINTER"
فن کی سرشت ہی میں شاید احساسِ درد سب سے زیادہ جاندار عنصر ہے
اور جس بطن سے وہ پیدا ہوتا ہے وہ ہے انسانیت ۔۔ فن تو دراصل رمزِ انسانیت ہے

میں تو فنِ موسیقی سے بالکل ہی ناواقف ہوں ۔ بالکل ہی نابلد ۔ لیکن بسم اللہ خاں صاحب کی شہنائی کی گونج ہمارے دیش کے ہر دل کی دھڑکن لگتی ہے ہمارے سارے معاشرے کے ڈھکے چھپے غم اور دکھ ان کی شہنائی کا اظہار بنتے ہیں ۔

کچھ دلبری کی بات بھی اور قربِ انسانیت کی بات بھی ۔ اور اپنے ہر سُر میں بس انسانیت ہی کو سنبھالے رکھنے کا تاثر ۔ قصہ مختصر زندگی کی دوری کا درد بھی اور قربت کی لذت بھی ۔ جس سے ہمارا گاؤں گاؤں بنتا ہے ۔ اور شہر شہر ۔

بس عوام ہی کا اظہار اور عوام ہی کی زندگی کے سارے سچے تاثر ۔ عجیب فن ہے ہم کو کچھ اس بات پر بھی غور کرنا ہے کہ فن کے ساتھ، خود فن کار کے رویئے سے بھی فن کی اصلیت متاثر ہوتی ہے ۔ آج فن و ادب میں بھی وہی ہو رہا ہے جو دوسرے شعبہ ہائے حیات میں ہو رہا ہے ۔ ہم جن رویوں کو شہرت پرستی، موقع پرستی، منفعت پرستی، مصلحت پسندی کہتے ہیں وہ بھی اسی استحصالی ذہنیت کے اگائے ہوئے پودے ہیں ۔ جواب بڑھ کر چھتنار ہو رہے ہیں اور آج انہی سایہ دار رجحانات کے سبب، ادب میں ملنے والے ردِ عمل سے یہی حقیقت زیادہ نمایاں ہونے لگی ہے کہ کبھی تو ادب برائے زندگی تھا پھر ادب برائے ادب بنا، لیکن آج ادب برائے ساہتیہ بن گیا ہے ۔

یہاں ایک بات یاد آ گئی کہ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کے ادوار مختلف فنون کے بے مثال اور زندہ جاوید شاہکار آج کے تو ہم سب کے لاقیمت اثاثے ہیں ۔ جن کی تاریخ ماہ و سال یا صدی کا بھی پتہ نہیں تو بھلا ان تخلیق کرنے والے فنکاروں کے نام نشان کہاں ملتے

حالانکہ ازمنۂ قدیم میں جب ایک فن کار صرف اپنے جذبۂ تخلیق کے زیرِ اثر اپنا فن تخلیق کرتا تھا اس وقت نہ کوئی رہبری تھی نہ سرپرستی کے سائے ۔ لگتا ہے ندی کے نتھرے ستھرے جھرنوں کی طرح فن کی تخلیق کے دھارے پھوٹ پڑتے اور بہہ نکلتے ۔

مختلف فنون کی تاریخ میں جو تخلیقاتِ فن شاہکار ہیں۔
حتیٰ کہ عجائبِ عالم ہیں۔ اُن کے فن کار یقیناً کسی بھی جذبۂ شہرت پسندی یا صلے یا ستائش کی تمنّا کے مال مسالوں سے محفوظ تھے۔ خواہ مصوری میں ہوں سنگ تراشی میں ہوں، موسیقی میں ہوں یا شاعری و ادب میں ہوں اور اُن کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ اُن کا فن اتنا عظیم اور لازوال تھا۔

ادب کی اہمیت، ادیب کی اہمیت ہوتی ہے اور وہ ان حالات میں اپنی تخلیق کی اہمیت جتانے کے لئے دفتر کے دفتر سیاہ کر سکتا ہے اس لئے بھی کہ آج یہ بات زیادہ واضح ہو رہی ہے کہ آج کا ادیب سماج کے لئے نہیں لکھتا بلکہ اپنے آپ کے لئے لکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے پہلے بھی یہ بات صحیح رہی ہو لیکن چونکہ ایک ادیب یا فن کار کی (ایک فنکار کی حیثیت سے) بقاء کا دار و مدار اس کی قبولیت، شہرت اور اس کی اہمیت پر ہوتا ہے جو وہ اپنے فن کے توسط سے حاصل کرتا ہے تو آج کے دور میں ادب و فن کی تخلیق کا بنیادی طور پر شاید یہی جواز بھی ہو۔ جو شعوری بھی ہو سکتا ہے اور غیر شعوری بھی لیکن چونکہ آج کے تیزی سے بدلتے ہوئے سماج میں اس کا مسابقتی پہلو زیادہ اہمیت اور اس سلسلہ میں ہر فرد کا عمل زیادہ سے زیادہ شدت اختیار کر رہا ہے۔ ہر فرد کی طرح ادیب و فنکار بھی اس فطری جہدِ مسلسل سے گھڑی بھر کے لئے اپنے آپ کو جدا نہیں کر سکتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماج کسی فرد کے اسی عمل کو قبول کرتا ہے جو سماج کی ترقی، اس کی اہمیت اور اس کی بقاء کے لئے ضروری ہوتا ہے اس لئے کہ کوئی بھی سماج اپنی جگہ ایک اجتماعی شعور کی تخلیق ہوتا ہے، اس کا پروردہ ہوتا ہے اگر آج کے سماج کو اس کی اپنی بقاء و ترقی کے لئے ادب و فن کی مزید تخلیق کی ضرورت نہیں تو سوچنا پڑتا ہے کہ ایسی صورت میں ادیب و فنکار کا کیا منصب رہ جاتا ہے؟

دو گھڑی کے لئے اگر یہ بات ہم مان بھی لیتے ہیں کہ آج کا سماج تخلیقی فن کو اہمیت نہیں دیتا اور اس کے ساتھ سرد مہری سے پیش آتا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس یقین کے باوجود کوئی فنکار اپنے فن کی تخلیق اسی جذبے اور اسی لگن کے ساتھ کرتا رہے گا ۔ ؟

ان سارے سوالوں سے قطع نظر میں یہاں مختصراً یہ بات کہنا چاہوں گا کہ اولاً کوئی فن کسی معاشرے کی ضرورت کی شکل میں وجود میں نہیں آیا۔ فن دراصل معاشرے کی نہیں فن کار کی ضرورت ہوتا ہے۔ فن نے کبھی اپنے آپ کو معاشرے کی ضرورت کے طور پر نہیں بلکہ صرف فن کی حیثیت سے تسلیم کروایا۔ پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ اظہار انسان کا فطری تقاضہ ہے لیکن کسی اظہار کو فن کا رتبہ دینے والی دراصل فن کار کی ایک مخصوص فطری صلاحیت ہوتی ہے جس کی بنیاد اس کی فطرت میں پائی جانے والی وہ حس ہوتی ہے جو فن کار پر کسی واقعے، کسی حادثے، کسی مشاہدے سے پیدا ہونے والے کسی تاثر کے اظہار کو کچھ ایسی خصوصیات سے آراستہ کر دیتی ہے جو اپنی جگہ ایک کیفیت پیدا کر دیتی ہیں اور وہ اظہارِ زندگی کا ایک عنصر اظہار بن جاتا ہے جو فن کے نام سے معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام پاتا ہے۔

آج کے حالات میں جب ہم فن کی عظمت کی بات کرتے ہیں تو یہ بات کچھ جذباتی لگتی ہے اور سائنس کی بیش بہا برکات کے ساتھ تشکیل پانے والا معاشرہ ابھی کچھ تصوراتی لگتا ہے تو کیوں نہ آج اس بات کو جانچنے کی کوشش کی جائے کہ دراصل آج فن کا تصور کیا ہے ؟ انسان کی تہذیبی تاریخ کے ساتھ ساتھ فن نے بھی اپنی زندگی کا ایک طویل سفر طے کیا ہے اور اب یہ دیکھنا ہے کہ آج وہ کس منزل پر ہے۔ ویسے فن کی تعریف ایک یہ بھی ہے کہ فن اپنے معاشرے کے نفسیاتی ماحول کی تخلیق ہوتا ہے۔ لیکن اکثر آج یہ بات بھی سننے میں آتی ہے کہ اب

فن فن ہی کہاں رہا؟ فن اگر آج بھی اپنی ساری اہمیتوں کے ساتھ باقی ہے تو
فن کا تصور یقیناً بدل چکا ہے۔ پتہ نہیں کتنے معاصرین اس بات پر اتفاق
کریں کہ فن کے ساتھ معیار کا جو ایک مخصوص تصوّر لگا ہوا تھا اس پر پتہ نہیں کب
سے قدامت کی گرد اٹی پڑی ہے۔ اب تو معیار کا تصور ہی غیر واضح ہو گیا ہے
ادب ہی کیوں ۔ آج کے کسی بھی فن پر نظر ڈالیئے تو اس کی عام
مقبولیت ہی اس کا معیار ٹھہرتی ہے۔ اور شاید آج کے دور میں اور آنے
والے ادوار میں بھی بات زیادہ صحیح ثابت ہو۔ فن کی تعریف آج کئی زاویوں
سے کی جاتی ہے۔ فن کی زندگی میں بھی بے شمار انقلابات آتے رہے ہیں۔ خصوصاً
فنِ مصوری اور فنِ سنگ تراشی میں تو بے حساب اسٹائلس، فارمس اور رجحانات
آتے جاتے رہے ہیں ۔ امریکہ میں تو آج فن کے تعلق سے اس قسم کی رائے کا
بھی اظہار کیا جاتا ہے۔
فن وہ ہے جس کا تخلیق کار اپنے ذاتی بل بوتے پر اس کو فن ثابت کر سکے
اور اس کی تخلیق کو فن کی حیثیت
سے ثابت کرنے کے لئے اس کو کچھ ہمدرد CRITICS مل جائیں۔

"ART HAS TO MAKE ITS OWN WAY BY DINT OF THE ARTIST'S PERSONAL FORCEFULNESS, AIDED BY THE RHETORIC OF FRIENDLY CRITICS - ART IS WHATEVER WE CAN BE MADE TO ACCEPT AS ART

آج کل تو یہ بھی ہوتا ہے کہ خوش قسمتی سے کسی ایسی تخلیق کو فن کی حیثیت
سے ماننے یا نہ ماننے پر بحث چھڑ جائے تو بہت ممکن ہے کہ اس کا تخلیق کار فن کی
دنیا میں ایک مستقل رجحان بن جائے ۔
اگر فن و ادب کا آج یہ تصوّر ہے تو شاید سماج کا تصور بھی کچھ ایسا ہی ہو
اس لیئے اِن حالات میں بہت ممکن ہے کہ فن و ادب اور سماج ایک دوسرے کی ضرورت

محسوس نہ کریں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج ادب عوام سے بے تعلق ہو گیا ہے اور ادب کا یہ رویہ دیکھ کر عوام بھی اُس سے بے تعلق ہو گئے ہیں۔ علاوہ اس کے آج جب تہذیب ہی ایک تنازعہ بن رہی ہے تو ایک عام انسان تہذیب کے پہلاؤں سے کیوں نہ بددل ہو جائے۔ عالم یہ ہے کہ اگر تہذیب کا کوئی عمل ایک عام انسان کی بہتری اور بھلائی اور بقاء کا وسیلہ نہیں بنتا تو وہ تو شاید ساری تہذیب ہی کو رد کر دے شعورِ خاص جب اس سطح پر آ تر سکتا ہے تو شعورِ عام کو کسی سطح تک جانے سے کون روک سکتا ہے۔ ایک عام انسان اپنے شعور کو ناکافی یا خام سمجھتے ہوئے صدیوں سے تہذیب، فلسفہ، ادب اور آرٹ وغیرہ کے پہلاؤں سے اپنی زندگی کی بہتری اور تعمیر کی آس لگائے رہا ہے لیکن آج کے تناظر میں اُس کا شعور ٹھوس ہے اور وہ زندگی کے حقیقی عمل کا واضح اور جامع تصور رکھتا ہے کہ اب وہ زندہ ہے تو سب کچھ زندہ ہے اگر وہ قابلِ احترام ہے تو سب کچھ قابلِ احترام ہے، ورنہ انسانی تہذیب، علم و فلسفہ اور قانون و ادب کا ہر لفظ نہ صرف ایک جھوٹ ہے بلکہ ایک فریب ہے اس لئے انسان کی ہر صلاحیت اور اُس کا ہر عمل جو آج کے اِن حقائق سے فرار اختیار کرے گا۔ وہ نہ صرف مذموم ہو گا، بلکہ بے وقعت بھی، وہ بھی اُس حکایتی ضمیر کی عدالت میں نہیں بلکہ عوام کی [illegible] عدالت میں۔ اور ہر وہ عمل جو ان حقائق کی لزومات اور مطالبوں کو وقت کی صداقت جان کر اُس کا پاس رکھے گا، اُس کا شعور رکھے گا۔ وہ خود بھی قابلِ قبول ہو گا، باوقار ہو گا اور انسانی زندگی کو معتبر و باوقار بنائے گا۔

آج یہ تلخ حقیقت اپنی واضح شکل میں ہم سب کے سامنے آ چکی ہے کہ اُنیسویں اور بیسویں صدی کا کوئی سیاسی یا معاشی نظریہ یا کوئی فلسفہ اکابرین فکر و عمل کی موقع پرستیوں، خود فریبیوں اور وقت کی ضرورتوں کے تحت ہونے والی سازشوں سے

محفوظ نہیں رہا۔ جس کے سبب سارا سیاسی، معاشی اور سماجی نظام دو اصطلاحی رویوں میں بٹ گیا۔ یعنی دائیں اور بائیں بازو کی قوتوں کے رویوں کے نام سے۔ لیکن نتیجتہً دیکھا گیا آن دونوں رویوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ اور اب تو اِن دونوں رویوں کی کوئی علیحدہ پہچان باقی نہیں رہی۔
بلکہ دونوں رویوں والی قوتیں دبی دبی زبان میں ایک دوسرے سے کہہ رہی ہیں "تو من شدی، من تو شدم" وقت اور ساری دنیا کی خود پسند اور مفاد پرست قوتوں نے اِن دونوں تبدیلیوں کے بہاؤ کا رخ ایک ہی گندے ساگر کی طرف موڑ دیا ہے۔

لیکن آج ایک لحاظ سے یہ بات بڑی حوصلہ افزا لگ رہی ہے کہ ہمارے آج کے ادب میں پائے جانے والے جو دو نمایاں ادبی رویئے ہیں۔ اُن سے اگر کوئی نئی فکر کا دھارا نکلتا ہے تو وہ ہے انسانی فکر و جذبے کے فطری بہاؤ کا۔ جو سارے عوام کی زندگی کو سیراب کرتا ہوا گذرے گا۔ نہ وہ کسی مخصوص انقلاب کا دھارا ہوگا نہ وہ "ذہین قاریوں" کی تلاش میں بہنے والا کوئی تنگ دھارا ہوگا ادب تو وہی ہونا ہے جو زندگی ہوتا ہے۔ زندگی بھی ایک معاشرے کی۔ معاشرے میں بسنے والے سارے نفوس کی زندگی۔ ادب کو ادب بننے کے لئے ایک فطری بہاؤ ہونا چاہیئے جو عوام پسند ہوگا اور عام فہم بھی۔ اب تک ہم نے جس طمطراق فہم و علم کو اپنے ادب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، وہ بھی ان دعوؤں کے ساتھ کہ یہ ادب عوامی ادب ہے اور عوام کے لیئے ہے وہ تاریخ میں ملنے والے کئی سیاسی فریبوں کی طرح ایک فریب ہے۔ لیکن آج جس ادب کی ضرورت ہے یا وقت جس قسم کے ادب کا مطالبہ کرتا ہے وہ صرف عوام پسند اور عام فہم ادب ہے جس کی راہوں میں شاید نہ کہیں کوئی سراب ملے گا نہ گرداب۔

آج کے دور میں ہم جن نظریاتی الجھنوں اور ان کی وضاحتوں کی کوششوں میں پھنسے ہوئے ہیں اُن سے کچھ حاصل نہیں لیکن یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ علم و ادب کی جو بنیادی افادیت ہے اور جو آپ کا مقصدِ اول ہے اُس کے حصول کی اِن کوششوں میں کوئی گنجائش نہیں ہے علم تو زندگی کی تفہیم کے لئے وجود میں آیا ہے نہ کہ تعقید کے لئے۔ وہ علم جو بجائے خود واضح نہیں ہوتا، اس میں شاید علم کی بنیادی صداقت نہیں ہوتی۔ اگر علم و ادب کی افادیت واقعی انسان کی زندگی کی رفعت ہے یا اس لئے کہ اس میں تفہیمِ حیات کی شکل میں مضمر ہے فلاحِ انسانیت تو کم از کم آج علم و ادب کی افادیت کو عام انسان تک پہونچ جانا چاہیئے۔ ساتھ ہی آج ایک ایسی تیز رفتار تبدیلی کی ضرورت ہے جو علم اور انسان کو ہر استحصال سے محفوظ رکھنے کی استطاعت و طاقت کی حامل ہو۔ صرف علم کی عظمت اب اپنی روشنی کھو چکی ہے۔ اب وہی روشنی علم ہے جو ہر انسان کے مفاد میں صرف عمل ہی نہیں بلکہ ایک کامیاب عمل بن سکے۔

آج کے تخلیق کار کے فرائض کے تعلق سے میں یہ عرض کر دوں کہ آج کے ادب میں زندگی کے تعلق سے جو مثبت رویہ آپکو ملے گا وہ اُس رویئے سے جدا ہو گا جس کو ترقی پسند ادب میں مثبت رویہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ آج کے ادب کا مثبت رویہ وہی ہو سکتا ہے جو آج کی فکر کے جلو میں آگے بڑھ کر زندگی کے نقاضوں کی تکمیل کی تلقین کرے گا۔ ترقی پسند تحریک کے جو بنیادی رویئے تھے وہ ایک مخصوص فکر کے اثبات سے پیدا ہونے والے انقلابی رویئے تھے۔ لیکن گذشتہ ۴۰۔۵۰ سال کی تاریخ نے دنیا میں ہونے والی جن تبدیلیوں کو حقائق کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اُن سے اثر قبول کرنے والی آج کی فکر میں انقلابی عناصر مدھم پڑ چکے ہیں۔ لیکن آج بھی اس نام نہاد آزاد دنیا میں بسنے والا انسان محسوس کر رہا ہے کہ اس آزادی کے نئے تصور میں بھی وہی صدیوں پرانی غلامی کی پرچھائیاں موجود ہیں اور وہ اپنے اسی تاریخی اضطراب و اضطرار

کی کیفیتوں میں مبتلا اس بات کا متلاشی ہے کہ اس کو پھر ایک حوصلہ جواں مل جائے جس سے ایک فکرِ تازہ کی تعمیر ہو۔ اس کا یہ احساس یقیناً ایک زندہ احساس ہے جو آج ہمارے تخلیق فن و ادب کا سچا لہجہ بن سکتا ہے اور مجھے یقین ہے آج بھی ایسا ادب تخلیق ہو رہا ہے لیکن حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ وہ کسی مخصوص سیاسی یا نظریاتی دباؤ سے آزاد ہے اور مختلف خانوں میں بٹا ہوا بھی نہیں ہے۔ یہ ادب ایک فکرِ آزاد کے ساتھ ایک سچے احساس کی تخلیق ہے جو ہو سکتا ہے اپنی سرشت میں ترقی پسند ہو لیکن کسی مخصوص ترقی پسند ادب کے تصور سے یا جدید ادب کے تصور سے بندھا نہیں ہے اس تخلیق کے ایک ایک لفظ میں انسانیت کے پھولوں کی خوشبو ملتی ہے۔ درد کی شکل میں بھی، احساسِ مسرت کی شکل میں بھی۔ اس تخلیق کا تخلیق کار کسی مخصوص نظامِ حیات یا کسی قانون یا زندگی کے کسی طرزِ عمل کو اپنے تخلیقی احساس پر بوجھ سمجھتا ہے تو نہ صرف اُن کو وہ برداشت نہیں کرتا بلکہ اپنی ساری صلاحیتوں کو روبہ کار لاکر اس پر ایک کاری ضرب لگاتا ہے یہ اس کا فرض ہے جو وہ ادا کر دیتا ہے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ایک عام بے حسی جو کل فطرتِ ثانی تھی آج فطرتِ اول بن گئی ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے معاشرے میں اول اول جو نظامِ حیات وجود میں آیا وہ ایک کامیاب ترین نظام ہوتا، شرط صرف انسانی فطرت سے ایک جذبۂ انسانیت اور دیانت داری کے ملنے کی تھی۔ لیکن آج کروڑہا سال کے بعد بھی ایک صالح، مستحکم، مستقل اور کامیاب ترین معاشرے کی بنیاد کے لئے اسی سنگ و خشت کی ضرورت ہے اور جسے جذبۂ دیانتداری کہا گیا اور جس کی تلاش میں انسان صدیوں سے بھٹک رہا ہے دنیا بھر کے فلسفوں کی شکل میں، دنیا بھر کے نظام ہائے حیات کی شکل میں بے شمار لوائحِ عمل کی شکل میں لیکن یہی بات کیا کم حوصلہ افزا ہے کہ آج بھی اس بنیاد کی تلاش میں انسان سرگرداں ہے

انسان کے شعور و ہمت کا ایک عنصر تو یقیناً ناقابلِ تسخیر رہا ہے کہ دنیا کی کئی بے مثال قوتوں نے اُس کی تباہی کے لئے اپنی طاقت آزمائی ہے لیکن ایسی کوئی قوت وجود میں نہیں آئی ہے جو اُس کو اُس کی ذات سے مایوس کر دے ۔

جب تک ایک سچا فنکار مکمل آزادیٔ فکر اور آزادیٔ اظہار سے لیس ہوگا وہ فنکار وہی ادب تخلیق کریگا جو آج کی زندگی کی سچی اور پُر اثر تخلیق ہوگی

A TRUE ARTIST IS PURELY INDIVIDUOLISTIC AT THE MOWMENTS IS CREATING HIS ART

کسی بھی تخلیقی فن کار کو کسی اندازِ فکر کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات اُس کی آزادیٔ فکر اور آزادیٔ اظہار کو محدود کر دیتی ہے۔ ہر سچا فنکار اپنی جگہ ایک تحریک ہوتا ہے۔ اور اپنے لئے وہ صرف وہی منزل منتخب کرتا ہے جس کی صرف اُس کے خیالات، جذبات، محسوسات اور اُس کا تخلیقی شعور اُس کی رہنمائی کرتا ہے۔ جس سے وہ گھڑی بھر کی غفلت نہیں برتتا۔ کیونکہ خود اُس کی زندگی کی تلاش اور اُس کا سکون اُس کو اُس کی اپنی فکر میں ملتا ہے جس پر اُس کی دانشوارانہ بقاء کا انحصار ہوتا ہے۔